اُفوّضُ امری الی اللہ انّ اللہ بصیرٌ بالعباد

بعد الحمد کہ دریں ایام فرخندہ فرجام نسخہ نور آگیں رحمت آثار گلشن رنگین

جاوید بہار گوہر دریائے معانی

یعنی

چمنستانِ مظفّر

از تصنیف شریف غوّاص دریائے فصیح اللّسانی شہسوار میدانِ صدق بیانی

جناب مولوی مظفر حسین خاں صاحب سلیمانی رضی

مشعر حالات منشی میر اولاد علی صاحب شاہ آبادی پروفیسر ٹرنٹی کالج

ڈبلن آیرلینڈ

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء طبع ہوا

محمود رقم

۱۱ ۵

یاد ایام

مصنفہ جناب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

یہ کتاب فاضل مصنف نے جناب نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس کی تحریک سے تالیف فرمائی ہے جس میں صوبہ گجرات کے اسلامی عہد کی علمی ترقیوں کی ولولہ انگیز تاریخ نہایت تحقیق و کاوش سے لکھی گئی ہے اس کے مطالعہ سے دور ماضی کا علمی مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ خطۂ گجرات بھی سلاطین اسلام کے زمانہ میں علم و فن کا ایک شاندار مرکز تھا مصنف کی تحقیقات و ریزہ چینی قابل تحسین و ستایش ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ، پہلے ایک روپیہ میں فروخت ہوتی تھی۔ اب ناظرین کی سہولت کے لئے اس کی قیمت دس آنہ کردی گئی ہے۔

اطلاع

کانفرنس کی تجارتی بک ڈپو کی مفصل فہرست کتب طلب کرنے پر مفت روانہ کی جاتی ہے

ملنے کا پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی خاتم المرسلین وعلی آلہ واصحابہ جملۃ اعلام الدین ؕ

اے نام دلکشائے تو عنوانِ کارہا
خاکِ درِ تو آبِ رخِ اعتبارہا

بہت سی نامور ہستیاں جن سے دنیا کو بے حد فائدہ پہنچا، کنج گمنامی میں پڑی ہیں اور کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا اور خدا جانے کیسے کیسے عدیم المثال نفوس آغوش زمین میں چھپے پڑے ہیں۔ جن کی زندگی کے نمونے پیش نظر ہوتے تو ہماری موجودہ نسلوں کے لئے شاہراہ ترقی و عروج میں روشن ترین

مشعلوں کا کام دیتے۔

اسی قسم کے بزرگوں میں ایک پروفیسر منشی سید **اولاد علی** صاحب ہیں جو پیدا تو ہمارے قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی میں ہوئے مگر آئرلینڈ شہر ڈبلن میں آغوشِ لحد کے سپرد کئے گئے۔ ان کے حالات کا پتا لگایئے اور ان پر غور کیجئے تو حیرت معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ ملک اودھ انگریزی اثر اور موجودہ تہذیب سے بالکل نا آشنا تھا اودھ کی ایک بستی کا رہنے والا اتفاقی طور پر جزائر برطانیہ میں پہنچتا اور اپنی ذات سے ترقی کر کے فلک رفعت کا آفتاب بن جاتا ہے۔

بے شک وہ میرے وطن کے لئے سرمایۂ ناز تھے اور میرا فرض ہے کہ ان کے حالات سے ہندوستان کی پبلک کو آگاہ کروں۔ مگر میرے لئے اس کوشش کی محرک صرف ہموطنی نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ منشی سید **اولاد علی** صاحب فقط شاہ آباد کے لئے مایۂ فخر نہ تھے۔ بلکہ ایسے بزرگ پر سارے ہندوستان کو فخر کرنا چاہیئے۔ جنھوں نے اس قوم کے استادی کی عزت حاصل کر لی جو ہندوستان کو وحشی و جاہل بتاتی اور ان میں تہذیب و تمدن کا سبق دے رہی ہے۔ ہندوؤں خصوصاً بنگالیوں نے

ہر حیثیت سے نمایاں ترقی کی۔ پارسی انگریزوں کے رنگ میں یہاں تک رنگ گئے کہ فی الحال مغربی تہذیب و معاشرت کے ایک ضمیمہ تصور کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ فخر مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی کسی قوم کو نہیں حاصل ہی کہ ہندوستان کی صبح تہذیب ہی کے زمانہ میں یہاں کا ایک عالم جا کے جزائر برطانیہ کی یونیورسٹیوں کا پروفیسر قرار پایا اور ان لوگوں کا معلم بن گیا جو ہمیں تہذیب کا سبق دینے کے لئے ہندوستان میں آتے اور بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہوا کرتے تھے۔

یہ فخر ہمیں صرف منشی سید **اولاد علی** صاحب کی ذات مجموعۂ کمالات سے حاصل ہوا۔ لہذا ان کے نام کو چمکانا اور ان کے حالات سے دنیا کو آگاہ کرنا تمام اہلِ ہند کا فرض کفائی ہی اور میں نے جو اس ملکی خدمت کو اپنے ذمہ لیا تو محض ہموطنی کے خیال سے نہیں بلکہ اس غرض سے کہ ملک کا یہ ضروری فرض ادا کر کے تمام دنیائے ہند کو اس کی ذمہ داری سے سبکدوش کردوں

راقم

خاکسار محمد مظفر حسین سلیمانی

مصنف بہارستان مخدوم، تاریخ نامۂ مظفری، گنجینۂ سلیمانی، چمنستان مظفر حیات نصرت، حیات مسیح

ساکن شاہ آباد ضلع ہردوئی۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندان نسب اور ولادت

سادات بنی فاطمہ کا ایک محترم خاندان مدت سے شاہ آباد ضلع ہردوئی میں آباد ہی جس کا سلسلہ نسب بارہویں پشت سے حضرت امام علی نقی پر منتہی ہوتا ہی۔ اور امام ممدوح سے حضرت سیدۃ النسا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا تک پہنچتا ہی۔ اس خاندان کے ایک نامور مورث سید جلال بخاری تھے جس سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ خاندان عراق عرب سے بخارا اور ترکستان کی ہوا کھاتا ہوا ہندوستان میں آیا۔ اودھ کی سلطنت کے عہد میں اس خاندان کے ایک ممتاز و محترم بزرگ سید ضامن علی ابن سید جمال الدین ابن سید کمال الدین ابن سید بہاء الدین ابن سید شمس الدین تھے جو خواتین شاہ آباد میں محترم اور واجب التعظیم مانے جاتے۔ اور ہر شخص ان کا ادب و احترام کرتا۔

ان کے منجھلے فرزند معالج الدولہ حکیم سید فرزند علی صاحب افسر الاطباء بھوپال تھے جن کے مفصل حالات ہم نے کتاب گنجینۂ سلیمانی میں شرح و بسط سے درج کئے ہیں۔

اور تیسرے فرزند جو منجھلے بھائی سے تین سال چھوٹے تھے **منشی سید اولاد علی صاحب** تھے
انھیں کے حالات لکھنے کے لیئے ہم نے اپنی اس تصنیف میں قلم اُٹھایا ہے۔
سید اولاد علی صاحب ۱۲۴۵ھ میں غرۂ شوال روز جمعہ کو دس بجے دن کے
عین اس وقت جب کہ مسلمان نہا دھو کے اور پُر تکلف کپڑے پہن کے دوگانۂ عید الفطر
ادا کرنے میں مشغول تھے پیدا ہوئے۔ یہی چیز بتاتی ہے کہ سید صاحب ایک اعلیٰ نعمت تھے
جو مسلمانوں کو حضرت رب العزت کی مہربانی سے ساعت سعید میں عطا ہوئی۔

تربیت و تعلیم

چونکہ ایک ممتاز شریف گھرانے میں پیدا ہوئے لہذا بچپن ہی اور آغوش مادری سے
اخلاق حسنہ کی تعلیم شروع ہوگئی۔ قصبہ کے اساتذہ سے خاندانی تعلیم پائی۔ فارسی و عربی کی
ابتدائی کتابیں شروع کرکے تھوڑی ہی عمر میں تکمیل کے لئے لکھنؤ کی راہ لی۔ جہاں آپ کے
پدر بزرگوار ملازم اور مقیم تھے۔ لکھنؤ ان دنوں علم و فضل اور اعلیٰ تہذیب و معاشرت کا مرکز
بنا ہوا تھا۔ علمائے جلیل القدر، فضلائے بے بدل، شعرائے نامور اور ہر علم و فن کے
صاحبانِ کمال وہاں جمع تھے۔ منشی سید اولاد علی صاحب نے ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد
سید ضامن علی صاحب اور اپنے نانا مولوی عبدالرحمن صاحب سے پڑھیں۔ بعد ازاں دیگر
اساتذہ باکمال کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا اور غالباً انھیں استادوں سے انھوں نے
بھی تعلیم پائی ہوگی جن کی شاگردی کا فخر آپ کے منجھلے بھائی کو حاصل تھا۔ ان استادوں میں
سب سے زیادہ ممتاز نام مفتی سعد اللہ صاحب کا ہے جن کے تلمذ کا فخر ہندوستان کے اکثر
صاحبان کمال کو حاصل تھا۔ سید صاحب نے علوم و فنون درسیہ کے علاوہ ادب و انشا اور
شعر و سخن کی طرف بھی توجہ فرمائی اور اچھے شاعر بن گئے۔ منجھلے بھائی کو شاعری کا بہت کم
شوق تھا۔ مگر اس فن میں وہ اپنے بڑے بھائی میر نجف علی صاحب کے پیرو تھے جو لکھنؤ کی

شائستہ ترین معاشرت کی مکمل تصویر تھے اور میر وزیر علی صبا کے لائق شاگرد تھے۔

ملازمت اور شاہی خاندان تک رسائی

لکھنؤ میں ان دنوں کسی کا خوش گو، بذلہ سنج اور شوخ طبع مشہور ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایسے لوگوں کو امرا و روسا ہاتھوں ہاتھ لیتے اور آنکھوں پر بٹھاتے اسی قدر دانی کی برکت تھی کہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی سکندر حشمت دارا مرتبت صاحب عالم مرزا محمد جواد علی بہادر عرف جرنیل صاحب کو اتفاقاً فارسی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا اور لکھنؤ میں ایک ذی علم مدرس کی تلاش ہونے لگی بعض قدردان احباب کی کوشش سے قرعہ انتخاب سید صاحب کے نام پر پڑا اور یکایک آپ کی رسائی اعلیٰ طبقہ کے امراء و روساء سے تجاوز کر کے خاص شاہی خاندان میں ہو گئی۔ چنانچہ صاحب عالم ممدوح کے استاد مقرر ہو گئے صاحب عالم عمر میں سید صاحب سے ایک سال چھوٹے تھے مگر نئے استاد کی مہارت و علمیت کے ساتھ ان کی شوخ طبعانہ زندہ دلیاں اور محققانہ نکتہ آفرینیاں دیکھیں تو حد سے زیادہ گرویدہ ہو گئے۔ چند ہی روز میں صاحب عالم کو آپ کے صاحب علم و فضل ہونے اور آپ کی نیک نفسی دیانت داری کا اس قدر یقین و اعتبار ہو گیا کہ اپنے معزز و ممتاز رفیقوں میں شامل کر لیا۔ اور ایک گھڑی کی جدائی بھی گوارا نہ ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب استادی کے علاوہ ایک ذی ہوش و قابل اڈیکانگ (مصاحب) کی خدمت انجام دینے لگے۔ دیگر مصاحبین نے یہ رنگ دیکھا تو باہم کھچڑیاں پکنے لگیں اور بعض کو سخت حسد ہوا۔ ان حاسدوں میں ایک نواب کلب علی خاں تھے جو جرنیل صاحب کے پرانے ندیمان صحبت

ف مرزا سکندر حشمت کی تعلیم پر حکیم مرزا مہدی لکھنوی مقرر تھے جن کو بہ نظر قدامت و رعایت پیشہ کے امجد علی شاہ نے حکمت الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ کیونکہ وہ اور ان کے والد دونوں طبیب تھے حکیم مرزا مہدی جب اپنے والد کے ہمراہ کربلا معلی گئے تو شاہزادہ عالی تبار کے لئے ایک جدید معلم کی ضرورت پیش آئی۔ قبل وزارت امین الدولہ نواب حسین خاں نے بھی کچھ پڑھایا تھا ۱۲

میں تھے سید صاحب کا تقرب دیکھتے ہی وہ انگاروں پر لوٹنے لگے اور درپے ہوئے کہ جس طرح بنے صاحب عالم بہادر کو سید صاحب کی طرف سے بدظن کردیں۔ ہمیشہ سر دربار چوٹیں کرتے اور سید صاحب اپنی علمی قابلیت و اعلیٰ فصاحت و بلاغت سے ہر بار نیچا دکھاتے۔ نواب کلب علی خاں چالاک اور شوخ طبع ضرور تھے مگر بے علم سید صاحب کا بھلا کیا مقابلہ کر سکتے۔ صاحب عالم کے دربار میں اکثر شاعری کا چرچا رہتا۔ شعر خوانی ہوتی، سید صاحب اپنا کلام بھی سناتے اور سارے مصاحبوں سے زیادہ داد پاتے۔ نواب کلب علی خاں نے ایک دن صاحب عالم سے کہا منشی میر اولاد علی کو شاعری و موزوں طبعی کا بڑا دعویٰ ہے اور حضور بھی بڑے سخن فہم و سخن سنج ہیں بھلا ان سے مناقب ہیں تو کوئی قصیدہ یا کوئی مرثیہ کہلوائیے۔ انھوں نے آج تک کبھی مناقب و مصائب میں کوئی شعر نہیں پڑھا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گل و بلبل کے سوا کچھ نہیں آتا۔ غالباً انھیں ائمہ معصومین سے ذرا بھی محبت نہیں۔ یہ طعن آمیز الفاظ سنکر میر اولاد علی صاحب اُس وقت تو خاموش ہو رہے۔ مگر دوسرے تیسرے روز جرنیل صاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ کل اتفاقاً میں میرزا دبیر صاحب کی ایک مجلس میں گیا تھا وہاں ایک نیا مرثیہ سننے میں آیا جو مجھے بہت پسند آیا اور اس کے چند بند یاد کر لئے ہیں۔ اجازت ہو تو سناؤں۔ یقین ہے کہ حضور سنکر خوش ہونگے۔ صاحب عالم کی صحبت میں تو روز ہی چرچے رہا کرتے تھے۔ بھلا میرزا دبیر کا مرثیہ سننے کا شوق کیسے نہ ہوتا فوراً سنانے کا حکم ہوا اور آپ نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ حاضرین صحبت بے اختیار ہو ہو کے داد دے رہے تھے۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کے نعرے بلند تھے اور خود صاحب عالم نے بھی بہت تعریف کی مگر آخری بند میں جب سید صاحب نے اپنے نام کا مقطع پڑھا تو سب لوگ دم بخود رہ گئے نواب کلب علی خاں کو اپنے داد دینے پر بڑی ندامت ہوئی۔ جرنیل صاحب نے آپ کی برجستہ گوئی اور زور طبیعت کی بے انتہا توصیف کی اور متحیر تھے کہ سید صاحب نے ایک ہی دن میں ایسا مرثیہ کیسے کہہ ڈالا جس میں نامور اساتذہ کا سا زور سخن ہے۔ اور لغزشوں سے بالکل پاک ہے۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم اس مرثیہ کے چند بند بھی نقل کئے دیتے ہیں تاکہ سید حسنؔ کی قادر الکلامی کا ایک نمونہ بھی نظر سے گزر جائے :

مرثیہ مصنفہ منشی سید اولاد علی صاحب

نام و نشانِ حیدرِ کرار کون ہے
حمزہ صفت جہاں میں نمودار کون ہے
جعفر کی طرح جنگ پہ طیار کون ہے
اور منصبِ علی کا سزاوار کون ہے
قابض ہے کون مثلِ علی کائنات پر
کس کی وغا کا شور ہے اب تک فرات پر

صحفِ امامِ دین میں تو تفسیر کون ہے
شہ کی سپر آلہ کی شمشیر کون ہے
کون و مکاں میں صاحبِ توقیر کون ہے
ہم نام ذوالجلال کی تفسیر کون ہے
جس کو حصول خلق میں یہ احترام ہے
وہ سیفِ ذوالجلال ہے عباس نام ہے

ہیبت وہ ہے شجاعوں کے دل تھرتھراتے ہیں
صولت وہ ہے کہ شیرِ ژیاں خوف کھاتے ہیں
جرأت وہ ہے عدو نہیں آنکھیں ملاتے ہیں
ہمت وہ ہے کہ نہر پہ پانی کو جاتے ہیں
یاں تو یہ ہو رہے ہیں تصدق امام کے
آمد سے واں لرزتے ہیں دل اہلِ شام کے

رن کارزار شمر و عمر تھرتھراتے ہیں
جنبش نہیں بدن کو جگر تھرتھراتے ہیں
ساکن ہے چرخ شمس و قمر تھرتھراتے ہیں
جبریل کو سکوت ہے پر تھرتھراتے ہیں
یہ عدل ضیغمِ اسدِ کردگار ہے
شیرِ فلک بھی گاو زمیں کا شکار ہے

رومی و زنگی و حلبی شامی و غسل　　بصری و کوفی و بلخیوں کے دل کے دل
یک جا عجم کے جمع تو یکسو عرب کے یل　　پر قول ہی سبھوں کا کہ ہے آمدِ اجل

ہی آج جنگ ابنِ شہ ذوالفقار سے
گھوڑے لہو میں ڈوبیں گے اس کارزار سے

ہر چند وہ اکیلا ہے اور رہم ہیں لاکھا　　پر اس پہ ہی یہ خوف کہ ہے دل ہی کانپتا
ہیبت نہ کیوں ہو کس کا پسر ہے وہ باوفا　　تنہا ہزاروں ہی سے لڑے شاہ لافتا

دم میں چراغ ہستی مرحب کو گل کیا
خیبر کا در اکھاڑ کے خندق کا پل کیا

اک دیو تھا جہاں میں عمر ابن عبد ود　　کیا کیا نہ اس نے جنگ میں کی تھیں حق سے کد
اک ہاتھ میں ہی دو ہوا وہ صاحب حسد　　چاہی نہیں علی نے کبھی جنگ میں مدد

تلوار کو تبوک میں جب دم علم کیا
بوجہ ذوالشریر کے سر کو قلم کیا

معلوم ہے یکہ بھی جیسا دلیر تھا　　عاجز تھا جس سے لشکر سلطان انبیا
اک ہاتھ میں شریر کو حیدر نے دو کیا　　حقا نہ تھا علیؑ سا جری کوئی دوسرا

تخصیص تھی یہی لقب بوتراب میں
کرار تھے یہ فوج رسالت مآب میں

آخر پسر اسی کا ہے یہ شیر باوفا　　بالکل علی کی شان ہی ہے سر سے تا بپا
میداں میں کوئی دم میں وہ آتا ہی دیکھنا　　پہلے لڑے وہ حوصلہ ہو جس کو جنگ کا

جو گرم ہیں نبرد میں وہ سرد ہوئیں گے
جو نو جیلے ہیں دل میں وہ سب گرد ہوئیں گے

یاں تو یہ فوج شام میں تھا ذکر جابجا ۔۔۔ عباس واں حسین سے ہیں طالبِ رضا
کہتے ہیں ہاتھ جوڑ کے یا شاہ دوسرا ۔۔۔ ہو اذنِ کارزار کہ اب ضبط تا کجا
چارہ نہیں خدا کی مشیت ہیں یا حسین
محروم میں رہوں گا شہادت سے یا حسین

اب اس کے بعد روز بروز جرنیل صاحب کے دل میں سید صاحب کی زیادہ جگہ ہوتی گئی اور تھوڑے زمانہ میں اس سرکار کے سب سے بڑے ذی اقتدار عہدہ دار آپ ہی تھے۔

اب جرنیل صاحب کو آپ کا اس قدر اعتبار تھا کہ باورچی خانہ اور خاصے کا اہتمام و انتظام آپ کے سپرد ہو گیا اور سید صاحب ہی کی نگرانی میں دستر خوان چنا جاتا نواب کلب علی خاں نے ایک دن باورچی سے سازش کر کے کھانا بے مزہ کرا دیا اور اس کا سارا الزام سید صاحب کے سر ڈالا۔ مگر صاحب عالم بہادر کو ان پر اس قدر اعتماد کہ دشمن کے کہنے کا بالکل خیال نہ کیا ادھر سید صاحب نے پوری کوشش سے اس معاملہ کی تحقیقات کی فوراً بدخواہ دشمن کی قلعی کھل گئی۔ اور ثابت ہو گیا کہ سب کیا دھرا انھیں ذات شریف کا تھا۔

یوں بھی زور نہ چلا تو آخری فتنہ انگیزی نواب کلب علی خاں نے یہ کی کہ صاحب عالم بہادر سے کہا حضور یہ شخص مذہب سنت جماعت کا پیرو ہے۔ اور کسی سنی پر بھروسہ کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ حضور داروغہ باورچی خانہ کسی شیعہ مومن کو مقرر فرمائیں۔ دشمن کا یہ اخیری حملہ تھا۔ سید صاحب کو طیش آ گیا۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ صاحب عالم کے سامنے کلب علی خاں کو سخت گالیاں دیں۔ اور کہا تیرا نام جس کسی نے کلب رکھا ہے خوب نہیں رکھا۔ خنزیر نام رکھتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ کتے میں صبر و رفاقت کے صفات ہوتے ہیں جس سے تو بالکل بے بہرہ ہے۔ مگر ہاں تجھ میں خنزیر کی سی نجاست و دناءت البتہ موجود ہے تجھے جناب امیر کی ذات پاک سے کیا نسبت۔ جس شیدائے مرتضوی کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ کے دروازہ کا کتا ہو اس میں صفات اعلیٰ ہوتے ہیں۔ مگر تو سراپا نجاست و خباثت

اور بے وفا ہے۔ لہذا حضرت امام علیہ السلام کو تجھ سے ویسی ہی دوری ہی جیسی کہ خنزیر سے ہونا چاہیے۔ علی مرتضیٰ خصائل حسنہ کو دوست رکھتے تھے۔ اور ہمارے جد امجد تھے چنانچہ ہم کو آپ کی نسل میں ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نہ تجھے۔ کیونکہ تو خود ہی اپنے آپ کو نواب درغان بتاتا ہے جن لقبوں کو سیادت سے کوئی تعلق نہیں۔ رہا اختلاف مذہبی تو دبیر الدولہ[۱] بہادر

[۱] ان کا خطاب و نام دبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید عبد اللطیف خان بہادر مقیم جنگ ہے ان کے والد سید عبد الحفیظ صاحب ابن سید نذر علی صاحب تھے۔ دبیر الدولہ نہایت متقی متدین عابد زاہد تھے۔ تہجد سے چاشت تک تسبیح خانہ میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ یہ قدم سے ممتاز الزمانی ملکہ آفاق نواب جہاں آرا بیگم بنت نواب عماد الدین خان بہادر کی سرکار میں جو محمد علی شاہ کی خاص محل تھیں ملازم رہے۔ امجد علی شاہ بچپن سے اپنی والدہ ملکہ آفاق کے وابستگان دامن میں ہونے کی وجہ سے ان کو جانتے تھے اور ان کی دیانت کے معترف تھے۔ تخت نشین ہوئے تو دبیر الدولہ کا خطاب عنایت کر کے ان کو مہتمم خزانہ عامرہ کے معزز عہدے پر مقرر فرمایا۔ جملہ ملازمین و متوسلین کو جو کچھ ملتا انھی کے ہاتھ سے ملتا۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں بھی اس خدمت پر ممتاز رہے۔ سلطان عالم باوجود عیش پرستیوں کے ان کا نہایت ادب و احترام کرتے۔ قیصر باغ کے میلوں میں جب تمام اراکین دولت کو شنگرفی کپڑے پہن کے حاضری کا حکم ہوا تو دبیر الدولہ بہادر بھی جبراً و قہراً گئے اور شنگرفی جوڑا فنس میں رکھ لیا کہ در دولت پر پہن کے فنس سے نکلیں جیسے ہی ان کی فنس ایوانِ شاہی کے نیچے زینے کے پاس رکھی گئی اور وہ فنس میں کپڑے بدلنے لگے لوگوں نے بادشاہ کو خبر کی وہ بے اختیار زینے کے پاس تک دوڑے آئے اور جیسے ہی دبیر الدولہ کو اوپر چڑھتے دیکھا کہنے لگے کہ آپ نے کیوں کپڑے پہنے۔ میرا مطلب آپ سے نہ تھا اور ندامت سے کہا کہ آپ اپنے معمولی کپڑے پہن کر آئیں۔ لئی مسجد میں ایک سبیل یادگار چھوڑ گئے۔ جن کے لئے اپنی جائیداد میں سے کافی روپیہ وقف کر گئے جو آج تک ان کی اولاد کی تولیت میں موجود ہیں۔ مولوی حیدر علی صاحب مصنف منتہی الکلام ان کے داماد تھے۔ یہ کتاب عہد شاہی میں انھیں کے گھر پر تصنیف کی گئی بقیہ بر صفحہ آئندہ

ظہیر الدولہ[۵۱] بہادر فقیر محمد خاں[۵۲] بہادر شرف الدولہ[۵۳] بہادر جو اس دولت ابد مدت کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ کیسے سخت سنی تھے اور دربار اودھ کس بے تعصبی سے ان کی قدر کرتا تھا دبیر الدولہ بہادر کے فرزند سید عبدالرحیم عرف حافظ امیر علی صاحب باپ کی زندگی ہی میں مر گئے تھے۔ پوتے حافظ عبدالغنی صاحب کو واجد علی شاہ نے بخشی السلاطین متدین الدولہ بہادر کا خطاب دے کر کلکتے میں اپنے ہمراہ رکھا اور کل ملازمین متعلقین حتیٰ کہ شاہزادوں و شاہزادیوں اور محلات عالیات تک کو تنخواہیں انھیں کے ہاتھ سے ملتی تھیں اور وہی ماہوار رقم سرکاری خزانے سے وصول کیا کرتے تھے۔ پھر جب متدین الدولہ بہادر کا انتقال ہوا تو دوسرے پوتے منشی عبدالعلی صاحب کو بخشی الملوک امانت الدولہ بہادر کا خطاب عطا ہوا اور اسی خدمت پر مامور رہوئے۔ اور بادشاہ کی وفات کے وقت تک وہ ہی بخشی رہے۔ تیسرے پوتے میر نذر علی صاحب نے لکھنؤ میں رہ کر بعد مدت انتقال کیا۔ تینوں پوتوں کی اولاد اس وقت تک موجود ہے۔ آپ کے پر پوتے سید برکات احمد صاحب سے جو پرانی وضع کے نمونہ اور ذی علم و فارغ التحصیل بزرگ ہیں۔ راقم کو بھی نیاز حاصل ہے۔ دبیر الدولہ بہادر نے غدر کے ایک سال بعد غالباً ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔

[۵۱] نواب ظہیر الدولہ بہادر کا نام نامی مولوی غلام یحییٰ خاں تھا۔ نہایت قابل کارگزار مدبر تھے۔ محمد علی شاہ بادشاہ نے ان کو خلعت وزارت سے سرفراز فرمایا تھا انھوں نے بڑی لیاقت سے فرائض منصبی انجام دیئے۔ قیصر التواریخ کے صفحہ ۲۶۵ میں عبارت مندرجہ ذیل ہے کہ فی الحقیقت ظہیر الدولہ بہت نیک نام رہے۔ جملہ اہلِ دربار و رعایائے شہر ان سے راضی رہے۔ افسوس قضا نے جلدی کی ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ میں دفعتاً ہیضہ وبائی سے انتقال کیا۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے ان کے دونوں بیٹوں کو خلعت ماتم پرسی ملا اور دو ہزار روپیہ درماہہ مقرر رہوا۔

[۵۲] فقیر محمد خاں بہادر کا خطاب حسام الدولہ تہور جنگ تھا۔ دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی رسالداری کے منصب پر فائز تھے۔ سترہ سو سوار ماتحت ہم رکاب چلتے تھے۔ بہت سی خدمتیں مثل تقسیم تنخواہ محلات شاہی ان کے متعلق تھیں۔ نظم و نسق ملکی میں دخیل رہتے۔ نظامت ہارے بیسواڑہ۔ بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

جاں نثار اور وفادار عہدہ دار رہ چکے۔ سب اہل سنت وجماعت ہیں جن کو تاجداران اودھ نے اقتدارات وزارت وسپہ سالاری کے عہدے عطا کئے۔ ملازمین واہل کاران دولت میں زیادہ تر اہل سنت ہی ہیں۔ بادشاہ کو مذہب کا خیال نہیں ہوتا اور سلطنت کے لئے مناسب ہی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دسلطان پوران کے نام رہیں۔ بسوان باڑی چکلہ داری کا خلعت ان کے داماد امام الدین خاں صاحب کے نام دیا گیا۔ چار سو گھوڑے جن کی اسامی تین تین سو روپیہ تھی خاں صاحب کی ذاتی ملکیت میں تھے۔ ایک لاکھ روپیہ نواب امین الدولہ بہادر نے بنا بر تعمیر عمارت خزانہ بادشاہی سے ان کو عنایت کیا تھا۔ گویا تخلص تھا۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ عربی مثل اہل زبان کے فصیح بولتے۔ نواب معتمد الدولہ بہادر وزیر اعظم کے مصاحب اور عہد غازی الدین حیدر بادشاہ ونصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہدہ داران وارکان دولت سے تھے۔ قدرتاً ایسے ذی ادراک وعالی دماغ تھے کہ آم کے درخت کا پتہ سونگھ کر اس کے پھل کے میٹھے اور کھٹے ہونے کا حال بیان کر دیتے۔ مرزا گنج ملیح آباد میں ایک تعلقہ چھوڑ گئے۔

۵۳۔ ان کا پورا نام خطاب نواب شرف الدولہ مظفر الملک مستقیم جنگ خواجہ محمد ابراہیم خاں بہادر تھا۔ نواب ظہیر الدولہ کے حقیقی بھانجہ تھے۔ تدین ودین داری کے ساتھ اُن میں ہر کام کرنے کی قابلیت موجود تھی جب تک زندہ رہے لکھنؤ میں باثر ومرجع انام رہے اپنے ماموں نواب ظہیر الدولہ کے عہد میں سفارت کے منصب پر سرفراز کئے گئے اور بڑی خوش اسلوبی سے یہ خدمت ادا کی تاریخ سلاطین اودھ میں ہے کہ نواب شرف الدولہ سے تمام اہل دربار موافق اور خود محمد علی شاہ بادشاہ اُن سے نہایت خوش تھے۔ بعد انتقال نواب ظہیر الدولہ کے ان کو بادشاہ ممدوح نے اپنے فرزند ولی عہد امجد علی شاہ کا پیش دست ومعتمد مقرر کر کے دس ہزار روپیہ ماہوار کی تنخواہ سے سرفرازی بخشی۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے باضابطہ طور پر سلطنت کا انتظام کیا۔ لاکھوں روپیہ ملک کی آمدنی میں بڑھا دیئے۔ ارکان دولت میں بھی تغیر وتبدل کیا۔ کتاب وزیر نامہ کے صفحہ ۸۰ و ۸۱ میں وزیر السلطان امیر علی خاں بہادر نے ان کے بارہ میں تحریر کیا ہے جس کو خود واجد علی شاہ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ نواب شرف الدولہ بہادر نے بقیہ بر صفحہ آئندہ

کہ دنیوی تعلقات میں تعصب کو دخل دیا جائے۔ خود میرے ہم وطن منشی محمد صالح صاحب شاہ آبادی نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں فرماں روائے اودھ کے عہد سے تاجلوس محمد علی شاہ بادشاہی کتب خانہ کے داروغہ رہے اور جملہ اودھ کے بادشاہ وقت ان کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ مہمات وزارت کو اس قابلیت و دانشمندی سے انجام دیا کہ مملکت کو رونق ہو گئی اور اس وزیر باتدبیر کی لیاقت و خوش کرداری سے جملہ صاحبان رزیڈنٹ موافق رہے۔ محمد علی شاہ کے آخر دم تک اس منصب جلیلہ پر نہایت نیک نامی سے حکمرانی کی۔ امام باڑہ حسین آباد کے تینتیس ۳۳ لاکھ روپیہ کے نوٹوں کا منافع چودہ ہزار روپیہ ماہوار جو قرار پایا اور اس کی بابت جو عہدنامہ مابین سرکار کمپنی اور بادشاہ اودھ تحریر ہوا اُس کی دفعہ، میں ہے کہ جملہ آمدنی رزیڈنسی سے نواب شرف الدولہ وصول کرکے اپنے ہاتھ سے وثیقہ داروں اور حق داروں کو تقسیم کیا کریں اور وکالت ان کو منجانب بادشاہ نسلاً بعد نسل عطا کی گئی۔ واجد علی شاہ نے مرزا کیوان قدر کی ولی عہدی میں ان کو خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا تھا۔ اور جب واجد علی شاہ کے عہد میں لارڈ ہارڈنگ بہادر لکھنؤ تشریف لائے تو نواب شرف الدولہ بہادر ہی گورنر جنرل موصوف کو آمادہ کرکے حسین آباد کی روشنی وغیرہ کی سیر کو لے گئے۔ کرنیل سلیمن صاحب نے جب ملکی بدنظمی دیکھی تو مہاراجہ دگبیج سنگھ والیِ بلرام پور کی معرفت نواب علی نقی خاں کے پاس کہلا بھیجا مدار المہامی کا عہدہ اپنے نام ہی رکھو مگر کام نواب شرف الدولہ سے لیا کرو وہ تمام کلیات و جزئیات پر حاوی ہیں اور تم کو کام کرنا نہیں آتا۔ وہ کام کریں گے تو ملک کو ترقی ہوگی اور ہم کو اطمینان رہے گا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب کہ ماہ مئی باغی فوج لکھنؤ میں اکٹھا ہوئی واجد علی شاہ کلکتہ میں تھے۔ مقدمہ سلطنت اودھ کا زیر غور تھا کہ باغیوں نے میدان خالی پاکر برجیس قدر کو جو واجد علی شاہ کے ایک نابالغ شہزادے تھے اور دس سال سے زیادہ سن نہ تھا تخت پر بٹھایا اور ان کی ماں حضرت محل سلطنت کی مختار کل بنیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو لکھنؤ میں تھی وہ معہ یورپین افسروں کے بیلی گارد میں محصور ہو گئی نئی سلطنت کی طرف سے عہدہ دار مقرر ہونے لگے۔ تحصیل وصول شروع ہو گئی۔ وزارت کے لئے بقیہ بر صفحہ آئندہ

اچھی نظر سے دیکھتے اور اُن کا بے حد پاس کرتے تھے۔

غرض یہاں ہمیشہ شیعہ و سنّی برابر سمجھے گئے اور سمجھے جاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نواب شرف الدولہ مجبور کئے گئے۔ مفتاح الدولہ نے بھی اس کی تائید کی انھوں نے عذر کیا مگر نہ مانا گیا۔ قطعی انکار میں مضرکی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخرکار برجیس قدر نے خلعت وزارت منگا کر ان کو پہنوا ہی دیا۔ اُنھوں نے گیارہ اشرفیاں نذر دیں۔ نواب حسام الدولہ نے اُٹھا کر حضرت محل کے ہاتھ میں رکھ دیں چھ سات ماہ حکومت رہی۔ جنرل اوٹرم نے نواب شرف الدولہ کو خیر اندیش و ذی ہوش جان کر حضرت محل کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ لڑائی موقوف کیجئے۔ ہم آپ کا کُل ملک واپس دے دیں گے۔ یہ مصالحت نہایت مناسب تھی مگر جاہل و سرکش تلنگوں نے کہا کہ ہم انگریزوں سے خالی کرائے دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب انگریزی فوج آگئی اور باغیوں کے پیر اکھڑنے لگے تو حضرت محل اور برجیس قدر نے نیپال جانے کا قصد کیا۔ حضرت محل سوار ہو کر نواب شرف الدولہ کے مکان پر تشریف لے گئیں اور کہا تم کو ہمارے ساتھ چلنا چاہیئے انھوں نے نذر دی مگر جانے میں عذر کیا کہ باغی فوج مجھے سرکار انگریزی کا متوسل جانتی ہے۔ اور ارکان دولت میں باہم دلی اتفاق نہیں ہے۔ القصہ جب لکھنؤ میں بم کے گولے برسنے لگے مستورات گھبرا کر گھر سے نکل کھڑی ہوئیں تو ان کے ہمراہ یہ بھی چلے قدرت اللہ تحویلدار نے کہا کہ چالیس ہزار روپیہ لے لیجئے جواب دیا کہ ایسے وقت میں خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ کشمیری محلہ کے چوراہے تک پہونچے تھے کہ باغی تلنگے آگئے حملہ کر کے ان کو گرفتار کر لیا اور حضرت عباس کی درگاہ میں لے جا کر روپیہ طلب کرنے لگے شرف الدولہ نے کہا کہ مجھے چھوڑ کر آدمی ساتھ کر دو دو لاکھ روپیہ دوں گا مگر باغیوں نے نہ مانا اور کہا کہ تم خیر خواہ نصاریٰ ہو یہ ناچار ہو کر منبر کے قریب نماز پڑھنے کو کھڑے ہو گئے۔ ۲۱ شعبان ۱۲۷۴ہجری کو ایک نامرد نے بندوق اور دوسرے ظالم نے تلوار ماری یہ سجدہ کے مقام پر گر پڑے اور جان بحق تسلیم ہوئے۔ شجاع لکھنوی نے یہ قطعہ تاریخ شہادت نظم کیا ہے

شرف الدولہ فلک مرتبہ ہم نام خلیل صاحب خلق و حیا منصب و فیاض و حلیم باقی برصفحہ آئندہ)

ان باتوں کی جرنیل صاحب نے بھی تائید فرمائی اور چونکہ ان کے دل میں سید صاحب کی طرف سے بہت جگہ تھی حاسد پُرکینہ کے کہنے کا بالکل لحاظ نہ کیا اور فتنہ جو اپنے آخری حربے میں بھی ذلیل و خوار رہا ؎ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست۔ الغرض دشمنوں کی ان دراندازیوں کا انجام یہ ہوا کہ صاحب عالم اور زیادہ مہربان ہو گئے حاسد ناکام و نامراد رہا اور دوست مسرور و شاد ہو گئے۔

اس کے بعد جب تک سلطنت اودھ برقرار رہی سید صاحب جرنیل صاحب کی سرکار میں سب سے زیادہ معزز خدمت پر مامور اور اپنے آقا کے منظور نظر رہے جرنیل صاحب بہت ہی اچھے اور مہرباں رئیس تھے۔ نہایت ذی اخلاق و صاحب مروت۔ توانا و تندرست اور قوی ہیکل جوان تھے۔ خوبصورتی میں بڑے بھائی واجد علی شاہ سے بھی کچھ بڑھے چڑھے تھے۔

لندن گئے تو وہاں کے اخبارات نے بھی قابلیت و خوش روئی کا اعتراف کیا اور آپ کا فوٹو شائع ہوا۔ چنانچہ اخبار السٹرٹیڈ نیوز مورخہ ۱۰ ؍جولائی ۱۸۵۷ء میں آپ کا فوٹو چھپا ہے اور آپ کے حلیہ اور وضع لباس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"شہزادہ میرزا محمد جواد علی سکندر حشمت بہادر برادر شاہ اودھ کی عمر تیس سال کی ہے۔ قد لمبا رعب دار چہرہ گندمی بال گھونگر والے اور آنکھیں

بقیہ صفحہ گزشتہ۔ شد بدرگاہ ضیابار جناب عباس | شد قتیل ستم لشکر غدار و لئیم
ماند بے گور و کفن جسم شہ نعش بر خاک | شد رواں روح لطیفش سوئے فردوس نعیم
آیئے آیئے شہدا را ز عنایات خدا | کفن از حلہ بود غسل ز آبِ تسنیم
زمزم کعبہ ازیں واقعہ شد چشم پر آب | پشت محراب دو تا گشت ازیں رنج عظیم

بدلِ چاک رقم کرد شجاعت تاریخ
شد سیہ پوش حرم از الم ابراہیم

نہایت سیاہ ہیں۔ توانا خوبصورت اور تنہائی پسند ہیں۔ بیش قیمت لباس پہنے رہتے
ہیں۔ سونے کی اونچی ٹوپی جو تاج نما ہے۔ اور اس میں مختلف قسم کے جواہرات
بکثرت جڑے ہوئے ہیں زیب سر رہتی ہے۔ اس میں چاندی کا نام تک نہیں۔
آپ کی درباری پوشاک زربفت کی ہے"

شہزادہ محمد جواد علی بہادر اور واجد علی شاہ دونوں بھائیوں کو خوبصورتی آبائی ورثے میں ملی تھی کیوں کہ ان کے والد امجد علی شاہ بھی نہایت خوب رو تھے۔ قیصر التواریخ میں لکھا ہے کہ امجد علی شاہ بہت صاحب حسن و جمال تھے اور اپنے باپ کے عہد تک جوان رعنا بنے رہے دربار شاہی میں کوئی شہزادہ ان کا مدمقابل نہ تھا۔ مگر تخت نشینی کے بعد تن و توش بڑھ گیا اور ۴۹ برس کی عمر میں جب کہ عین شباب معلوم ہوتا تھا ماہ صفر ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ جرنیل صاحب کے ایک جانب کولے میں کچھ پیدائشی نقصان تھا جس کی وجہ سے ذرا لنگڑاتے تھے۔

آئین سلطنت کے مطابق امجد علی شاہ نے جب واجد علی شاہ کو ولی عہد مقرر کیا تو انہیں ساری فوج کی سپہ سالاری عطا فرمائی۔ سید صاحب ان کی سرکار میں تھے اور خوشی کے چہچہے ہو رہے تھے کہ یکایک ماہ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ ہجری کو دولت برطانیہ نے مملکت اودھ کو اپنی قلمرو میں منضم کر لیا۔ اور آناً فاناً یہ معلوم ہوا کہ جیسے لکھنؤ میں قیامت آگئی۔ خاندان شاہی نے برٹش گورنمنٹ کی اس کارروائی کو خلاف انصاف خیال کیا۔ مگر بجائے کسی قسم کی شورش و مخالفت کے باضابطہ پیروی کا ارادہ کیا۔ چنانچہ قرار پایا کہ نہایت باوقعت شاہی وفد (ڈپوٹیشن) انگلستان جا کر ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے دربار میں فریادی ہو۔ اس ارادہ سے خود بادشاہ۔ جرنیل صاحب دونوں کی والدہ محترمہ جناب عالیہ نواب ملکہ کشور اور بادشاہ کے ولی عہد بہادر نے وطن کو خیرباد کہی۔ لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ اس انقلاب کے موقع پر منشی میر اولاد علی صاحب کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ اور بجوشش دل سے شہر آشوب کے طریقہ

ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

کوئی شے جو پہونچے بحدِ کمال | تو آخر ضروری ہے اس کو زوال
لگا ہے یہ نقصان ہر سود میں | یہی فرق ہے عبد و معبود میں
پئے روز روشن ہیں شبہائے تار | خزاں باغ کی بعد فصلِ بہار
کمال آج گر ہے تو کل ہے زوال | جو ہے بدر آخر وہ ہوگا ہلال
یہ دنیا نہیں قابلِ اعتبار | بُرا ہے زمانہ کا لیل و نہار
جو سر آج زینت دہِ تاج ہے | وہ کل ایک تکیہ کا محتاج ہے
وہ گلشن کہ جس میں ہزاروں تھے پھول | وہاں دیکھئے تو جمے ہیں ببول
جہاں پر چہکتے تھے مرغانِ باغ | وہ ہے مسکن کرگس و بوم و زاغ
جہاں کل جواہر کے انبار تھے | کروروں درم اور دینار تھے
وہاں کیا ہی اب خاک ہی سنگ ہیں | عجب کچھ زمانہ کے نیرنگ ہیں
سروں پر تھے جن کے جواہر کے تاج | جو لیتے تھے شاہانِ سرکش سے باج
جو تھے تخت شاہی پہ مسند نشیں | وہ ہیں خواب میں آج زیرِ زمیں
کرا دانی از خسروانِ عجم | ز عہدِ فریدون و ضحاک و جم
که بر تخت ملکش نیامد زوال
نماند بجز ملک ایزد تعال

خاندان شاہی اودھ کا انگلستان جانا

جرنیل صاحب جب بارادہ لندن لکھنؤ سے روانہ ہوئے تو اُن کے کثیر التعداد ملازموں اور وابستگان دامن دولت میں سے خاص خاص وفادار و کارگزار ملازمین منتخب کر لئے گئے۔ انھیں میں ایک بلکہ سب سے زیادہ سربرآوردہ سید صاحب تھے۔

چونکہ وہ نہایت معتمد علیہ اور ہر وقت و ہر حالت کے انیس تھے لہذا جرنیل صاحب نے
ان کی مفارقت گوارا نہ کی۔ اور وہ بھی کمال جاں نثاری سے اتنے بڑے سفر عظیم میں آقا
کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ سید صاحب کے بھائی اور والدین جو اس وقت تک
بقید حیات موجود تھے کسی طرح اجازت نہ دیتے تھے کہ اتنے بڑے خطرناک سفر کو
اختیار کریں۔ جن کے اصرار سے سید صاحب ایک تردد و پس و پیش میں پڑے ہوئے
تھے۔ مگر خود جب جرنیل صاحب بہادر نے ان کو سامنے بلا کے بہ نفس نفیس ارشاد فرمایا کہ
"کیا اس مصیبت میں آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں گے" تو دل بھر آیا اور عرض کیا "آقا کی اطاعت
و رفاقت خدا اور رسول کے حکم سے نوکر پر واجب ہی۔ نمک حلال وہ ملازم ہے جو آقا کی
خوشنودی خاطر کے لئے اپنی جان فدا کرنے میں بھی دریغ نہ کرے۔ اور مصیبت کے موقع
پر آقا کے اوپر جاں نثاری کرنے کو بھی نمک حلالی سمجھے۔ لہذا میں آپ کے ہمراہ ہوں
اور جب تک جان میں جان ہے آپ کو کبھی کسی تکلیف میں تنہا نہ چھوڑوں گا۔" الغرض
سید صاحب نے والدین و اعزاء کے کہنے کا مطلق خیال نہ کیا اور مرزا سکندر حشمت بہادر
کی رفاقت میں وطن کو خیر باد کہہ دی اور آخر انھوں نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ جرنیل صاحب کی
وفات تک ایک گھڑی کے لئے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ خاک بنگالہ پہونچ کے بادشاہ کی طبیعت
ناساز ہو گئی۔ اطبا نے سفر کو ان کے حق میں مضر خیال کیا۔ آخر بعد غور و خوض کے قرار پایا کہ
مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب اور بادشاہ کے بڑے فرزند یعنی ولی عہد سلطنت
میرزا محمد حامد علی خاں بہادر اور والدۂ محترمہ ملکۂ کشور جناب عالیہ ضروری ملازمین کے ایک کافی
گروہ کے ساتھ لندن جائیں اور ملکہ معظمہ سے ملنے کے بعد استرداد سلطنت کے لئے پارلیمنٹ
میں استغاثہ دائر کریں۔ اس تجویز کے مطابق۔ مذکورہ بالا ارکان خاندان شاہی ایک سو دس [۱۱۰]
ملازمین و رفقاء کے ساتھ کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔ ہمراہیوں میں مولوی مسیح الدین خاں صاحب
متوطن کاکوری جو بادشاہ کے وکیل و مختار تھے، جلیس الدولہ بہادر بادشاہ کے ایک

قابل ایرانی مصاحب منشی سید اولاد علی صاحب جرنیل صاحب کے ایڈیکانگ و سکرٹری
باقی اہل دفتر و خدام تھے اور برانڈن صاحب جو سلطنتِ اودھ کے ایک پرانے ملازم تھے
بوجہ تجربہ کاری اس معزز شاہی قافلہ کے مہتمم سفر قرار پائے۔ بطریق سفر خرچ دس لاکھ روپیہ نقد
سامان آسائش کے پانسو صندوق ہمراہ رکھے گئے۔ اس کے سوا جو سامان سفر ساتھ کیا گیا
اس میں چند اعلیٰ درجہ کے جواہرات کا ایک صندوقچہ تھا اس میں ایک بیش بہا الماس، ایک یاقوت
و زمرد کا ہار، ایک مرصع کنگھی، ایک نہایت قیمتی مرصع انگوٹھی، ایک موتیوں کا ہار وغیرہ
بیش بہا چیزیں تھیں۔ کلکتہ میں ستر ہزار روپیہ پر ایک پورا جہاز کرایہ کیا گیا جس پر سوار ہو کے
۱۴/ شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸/ جون ۱۸۵۶ء کو اودھ کا یہ شاہی قافلہ بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا
کہتا ہوا انگلستان کی طرف روانہ ہوا۔ جہاز مدراس اور عدن میں ٹھہرتا ہوا ۱۵/ ذیقعدہ کو سویز
میں لنگر انداز ہوا۔ اس وقت تک نہر سویز نہیں کھدی تھی لہذا ضرور تھا کہ یہ عالی مرتبہ مسافرانِ
ہند جہاز کو یہیں چھوڑ کے خشکی کی راہ سے اسکندریہ جائیں اور وہاں سے دوسرے جہاز
پر بیٹھ کر آگے کی راہ لیں۔ سویز میں جس وقت جہاز سے اسباب اتارا جا رہا تھا معلوم ہوا
کہ جواہرات کا مذکورہ بالا صندوقچہ غائب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں تین عدد جواہرات تقریباً
ایک کروڑ روپیہ کی مالیت کے تھے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ نیلم اور الماس خواجہ سراؤں
نے جو محلات کی خدمت کے لئے ہمراہ رکاب تھے وہ صندوقچہ اپنے خدمت گار حسنو کو دیا
کہ جہاز سے اتار کے کنارے لے جائے۔ جہاز سے اترتے وقت اس نے یکایک غل مچایا
کہ صندوقچہ میرے ہاتھ سے سمندر میں گر گیا۔ نیلم نے غصہ میں آکر حسنو کو دو چار گھونسے بھی مارے
مگر صندوقچہ کا پتہ نہ لگنا تھا نہ لگا۔ برانڈن صاحب اور رئیس الدولہ بہادر کشتی پر سوار ہو کے
اور غوطہ خوروں کو ساتھ لے کے اس مقام پر گئے جہاں صندوقچہ کا گرنا بتایا جاتا تھا۔ اور بہت
ڈھونڈھوایا مگر کہیں پتہ نہ لگا۔ اس واقعہ کا جو دراصل ایک سانحۂ عظیم تھا سب کو نہایت
افسوس ہوا۔ اور بعض لوگوں نے تو اس کو ایک سخت بدشگونی تصور کر لیا۔

لوگوں میں طرح طرح کے خیالات تھے اور بعض کو یقین تھا کہ انھیں دونوں خواجہ سراؤں کی چالاکی و بدمعاشی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرتقدیر سب صاحب خشکی کا سفر کر کے دارالسلطنت مصر قاہرہ میں پہونچے۔ وہاں چند روز قیام رہا۔ اہل قافلہ نے مصر کی قدیم عمارتوں اور اہرام مصری کی سیر کی۔ مولوی مسیح الدین خاں جاکر عباس پاشا خدیو مصر سے ملے اور نہایت خموشی کے ساتھ آگے کی راہ لے کر اسکندریہ میں پہونچے۔ وہاں سے دوسرے روز جہاز پر سوار ہو کے لنگر اُٹھایا تو چند روز بحیرۂ روم میں سفر کر کے آبنائے جبرالٹر سے نکل کے اٹلانٹک اوشن میں سفر شروع کیا۔ اور تھوڑی مدت میں انگلستان کے ساحلی شہر سودھمٹن میں جا پہونچے۔ جہاز لنگر انداز ہوا۔ یہاں سے لندن دو تین گھنٹے کی راہ ہے جس وقت یہ لوگ جہاز سے اترے اور اسباب اُتارا جا رہا تھا وہاں کی ہزارہا خلقت کا ٹھٹ لگ گیا جو ہندوستان کے شاہزادوں اور جناب عالیہ کی سواری کی شان دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

جس وقت شاہزادے چوکڑی گاڑی پر جلوہ فرما ہوئے ہیں ہزارہا انگریز گھیرے ہوئے اور ہجوم لگائے ہوئے تھے۔ ولی عہد بہادر کا بالکل عنفوان شباب تھا۔ نہایت موزوں قد خوبصورت اور نازک اندام تھے۔ بشرے سے ذہانت و ذکاوت ٹپکتی تھی۔ ایک مغرق کارچوبی سرخ قبا پہنے تھے۔ جو اُن کے حُسن و جمال پر نہایت ہی زیب دیتی تھی۔ اُن کے برابر مرزا اسکندر حشمت خوش رو اور قوی ہیکل جوان رونق افروز تھے۔ لباس جواہرات سے مرصع تھا۔ سر پر جڑاؤ تاج زریں اور کمر میں نہایت پرتکلف ولایتی تلوار تھی۔ جناب عالیہ کانوں میں صرف دو بجلیاں پہنے تھیں۔ مگر لباس نہایت ہی بھاری اور پرتکلف تھا اور اپنے بیٹے اور پوتے سے بہت مشابہ معلوم ہوتی تھیں۔

ساحل سے روانہ ہو کر یہ قافلہ سودھمٹن کے ہوٹل میں ٹھہرا یہاں بھی شوق زیارت میں خلقت کا انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میئر بڑے نے جو اس خاندان شاہی کے

قدیم اور اعلیٰ ترین خیر خواہوں میں تھے تماشائیوں کی طرف متوجہ ہو کر ایک تقریر کی جس میں پہلے تو شاہ اودھ کی تعریف کی پھر شاہی خاندان کے ان معزز مہاتوں کی عظمت و شان بیان کی اور بتایا کہ شاہان اودھ کو مدت دراز سے دولت برطانیہ کے ساتھ خصوصیت رہی ہے اور ہمیشہ سچے دوست رہے ہیں۔ پھر جوش میں آکر کہا۔ ہاہاہا! اے اہل انگلستان یہ حضرات پانچ ہزار میل کی مسافت طے کر کے اپیل کرنے کو آئے ہیں۔ اور برطانیہ کے انصاف کے طالب ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کا ملک اپنی قلمرو میں شامل کر کے انھیں تاج و تخت سے محروم کر دیا ہے۔ گورنر جنرل کشور ہند لارڈ ڈلہوزی بھی اس امر کے مقر ہیں کہ یہ شاہی خاندان ہمیشہ صادق الوداد اور وفادار رہا۔ گوالیار کی مہم میں پنجاب کے معرکے میں اور نوٹوں کی ارزانی کے وقت جب کہ سرکار کمپنی بہادر کو سخت دقتوں کا سامنا ہوا تھا ہمیشہ شاہ اودھ نے ساتھ دیا۔ اور اپنے ترک سواروں کے رسالہ کے گھوڑے بھیج دیئے اور کمک کو فوج بھیجی۔ اب تک کمپنی شاہِ اودھ کی ڈھائی کرور روپیہ کی قرض دار رہی۔ لہذا دوستو انصاف کرو ایسے دوست کا ملک لے لینا کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ اگر اہل کاروں نے غفلت کی تو ممکن تھا کہ وہ بدل دیئے جاتے۔ اگر بادشاہ کی نسبت کہا جائے کہ وہ عیش پرست ہیں تو ممکن تھا کہ اس خاندان کا کوئی دوسرا شہزادہ ان کا بھائی یا بیٹا تخت پر بٹھا دیا جاتا۔ بھلا تمھیں بتاؤ کہ اگر تمھارے پڑوس کی کوئی سلطنت تمھارے بادشاہ کا ملک چھین لے تو تم گوارا کرو گے اس پر حاضرین نے نعرے بلند کیئے کہ ہرگز نہیں۔

پندرہ روز تک یہ محترم قافلہ سودہمٹن میں مقیم رہا تاکہ سفر بحری کا تکان دور ہو۔ اور لوگ اس سرزمین کی آب و ہوا سے مانوس ہو جائیں علاوہ بریں اسی مدت کے اندر لندن میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ وہاں ایک وسیع مکان جو ہارلی ہاؤس کے نام سے مشہور تھا پانچ ہزار روپیہ ماہوار کرایہ پر لیا گیا۔ اور ۱۳ اگست کو سارا قافلہ سوادِ لندن میں داخل ہو کر اس مکان میں فروکش ہوا۔

یہاں قیام پزیر تھے اور ابھی ارکان دولت برطانیہ سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی کہ واجد علی شاہ نے مزید احتیاط کلکتے سے اور چار لاکھ روپیہ بھیج دیئے اور ساتھ ہی سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ کی بلوبک کا مدلل جواب بھی مرتب کرا کے بھیجا۔

سلیمن صاحب نے بادشاہ پر ایک سو دس الزام عاید کئے تھے اور یہی الزام الحاق اودھ کے محرک ہوئے تھے۔ اس جواب کے علاوہ بادشاہ نے ملکۂ معظمہ کے نام اپنا ایک خط بھی بھیجا۔ اور ہدایت کی کہ یہ مراسلہ ملکہ معظمہ کی خدمت میں پہونچے۔ اس تحریر میں پہلے بتایا گیا تھا کہ سرکار انگلشیہ اور سلطنت اودھ میں کیسے تعلقات رہے ہیں۔ پھر لارڈ ڈلہوزی اور رزیڈنٹ لکھنؤ کی بدگمانیوں کا تذکرہ کرکے شکایت کی تھی کہ بعد انتزاع سلطنت لکھنؤ میں بادشاہ کا خانگی سامان کس طرح بے دردی سے تباہ اور غارت کیا گیا۔ ۱۱ اکتوبر کو جرنیل صاحب اور ولی عہد بہادر کی ملاقات ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ قرار پائی۔ دونوں صاحب سوار ہو کر انڈیا ہوس میں پہونچے۔ پارلیمنٹ کے سکرٹری وغیرہ نے گاڑی تک آکے استقبال کیا۔ مشایعت کرکے اندر لے گئے ارکان پارلیمنٹ میں سے جو صاحب عربی و فارسی زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے انھوں نے پہلے ان محترم مہمانوں کو لے جاکر عجائب خانہ کی سیر کرائی۔ پھر دعوت کے کمرے میں لے جاکے بٹھایا۔ میوہ جات وغیرہ سے تواضع کی۔ پھر ایک خلوت کے کمرے میں لے گئے اور ارکان سلطنت برطانیہ سے انتزاع سلطنت کے معاملہ میں گفتگو شروع ہوئی۔

ارکان پارلیمنٹ کی طرف سے کہا گیا کہ جنرل سلیمن نے بادشاہ اودھ پر ایک سو کئی الزام عاید کئے ہیں جن میں سے کئی الزام ہمارے نزدیک درجہ ثبوت کو پہونچ گئے ہیں۔ انھیں الزاموں کی بنا پر یہ قرار پایا ہے کہ بادشاہ کو اپنے مصارف کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ دیئے جایا کریں اور لکھنؤ کے گرد پانچ پانچ کوس تک ان کی حکومت قایم رہے۔ یہ علاقہ جس کے محاصل کا تخمینہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کیا جاتا ہے ہمیشہ جاگیر کی حیثیت سے بادشاہ کے قبضہ میں رہے گا۔ اس موقع پر مولوی مسیح الدین خاں نے تمام معاملات پر نہایت مدلل تقریر کی

اوّل سے آخر تک کل واقعات بیان کر کے کہا باوجودیکہ دولت برطانیہ اور سلطنت اودھ کے درمیان مراسم و اتحاد یک جہتی قایم تھے اور سلطنت مذکورہ سے کوئی امر خلاف معاہدہ نہیں سرزد ہوا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی چیز اس خلاف امید کارروائی کی محرک ہوئی کہ انتزاع سلطنت کر لیا گیا۔ جو عہدنامہ حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ کے زمانے میں ہوا تھا اُس کی مدِّ ششم کے مطابق عمل کیا جاتا تو چنداں محل شکایت نہ ہوتا مگر یہ کارروائی تو اصولاً بالکل خلاف انصاف ہے۔ ممبران پارلیمنٹ نے کہا بتایئے کسی ایسے معاہدے کو ہم نے کب منظور کیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس معاہدے کا ثبوت دے کر کہا امجد علی شاہ یا واجد علی شاہ کے زمانہ میں کوئی جدید معاہدہ ہوا ہو تو اُس کو پیش فرمایئے ورنہ اسی معاہدے کے مطابق کارروائی ہونی چاہیئے جو پہلے سے چلا آتا ہے۔ اس کے جواب میں ارکان پارلیمنٹ نے تامل کیا۔ پھر مولوی مسیح الدین خاں صاحب سے ان کا مختارنامہ طلب کیا۔ تاکہ اس کی بنیاد پر وہ گفتگو کرنے کے مجاز تسلیم کئے جائیں۔ مختارنامہ پیش ہوا اور سب نے اس کو قبول کیا۔
اس کارروائی کے بعد صاحبانِ عالی شان نے شاہزادوں کے یہاں دعوت قبول فرمائی اور ان کے فرودگاہ میں تشریف لائے۔ عمایدِ سلطنت برطانیہ یعنی ارکان پارلیمنٹ کی ملاقات اور اُن سے گفتگو ہو لینے کے بعد جناب عالیہ اور شاہزادگان والا تبار کی علیا حضرت ملکۂ معظمہ وکٹوریہ سے ملنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تاریخ مقررہ کو یہ معزز مسافران اودھ قصر بکنگھم میں پہونچے جیسے ہی گاڑی رُکی۔ چار میمیں جو ہندوستانی زبانیں جانتی تھیں۔ جناب عالیہ کے استقبال کو آئیں۔ اور سب کو قصر کے اندر لے جا کر کرسیوں پر بٹھایا۔ فوراً ملکہ معظمہ برآمد ہوئیں۔ جناب عالیہ برقع پہنے ہوئے تھیں اُٹھ کر ملیں اور نذر دی۔ ملکۂ معظمہ نے ان سے مصافحہ کیا۔ پھر شاہزادوں سے ہاتھ ملایا۔ جناب عالیہ کی کرسی ملکۂ معظمہ کی کرسی کے عین مقابل تھی۔ ان کے داہنے بائیں دونوں شاہزادے تھے۔ پس پشت مولوی مسیح الدین خاں صاحب کھڑے تھے۔ جناب عالیہ کی کرسی کے پیچھے سر جان بیچ کلارک کھڑے تھے۔ جو ترجمان کا کام دیتے

اور انھیں کے توسط سے باہم باتیں ہوئیں۔

ابتداءً سفر دریا اور انگلستان کی آب و ہوا کے متعلق گفتگو رہی۔ پھر ملکہ معظمہ نے اپنے ولی عہد پرنس آف ویلز کو بلایا۔ جناب عالیہ نے انھیں کھینچ کر گود میں بٹھا لیا۔ اب جناب عالیہ نے ایک نہایت خوبصورت اور نفیس مرصع عطردان جس پر بیش بہا موتی جڑے تھے پیش کیا۔ بادشاہ کا خریطہ بھی اُسی وقت نذر کیا۔ ملکہ معظمہ نے اس کو قبول فرمایا۔ اتنی ہی کارروائی پر ملاقات ختم ہوگئی۔ اور ملکۂ معظمہ نے ایک ہفتہ کے بعد تفصیلی ملاقات کا وعدہ فرمایا۔

شاہ اودھ اور ان کے خاندان اور ان کی ولایت کی کارروائیوں کے متعلق جو کاغذات واخبارات مولوی مسیح الدین خاں بہادر کا کوروی وکیل شاہی بعد واپسی لندن سے ہمراہ لائے تھے وہ آج تک ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف کے صاحبزادہ مولوی اکرام الدین خاں صاحب پنشنر کلکٹر دکن نے از راہِ اخلاق کریمانہ وہ تمام نایاب کاغذات واخبارات راقم کو مرحمت فرمائے اور خاکسار نے اُن کو بغور دیکھا۔ بعض اخبارات نے شاہ اودھ کے خاندان کے فوٹو بھی شائع کئے ہیں چنانچہ ملکہ معظمہ کی ملاقات کے زمانہ میں جو گروپ مرزا ولی عہد بہادر اور مرزا سکندر حشمت جرنیل صاحب اور مولوی مسیح الدین خاں بہادر کا لیا گیا تھا وہ بھی صفحاتِ اخبار پر موجود ہے۔ اور بعض پرچوں میں جناب عالیہ مادر واجد علی شاہ کے غسل اور جنازے کے سین دکھائے گئے ہیں۔ یہ اخبارات السٹریٹید لندن نیوز مارننگ نیوز۔ کورٹ جرنل وغیرہ ہیں۔ ان میں مفصل طور پر انتزاع سلطنت اودھ کے اسباب۔ ملکہ معظمہ سے خاندانِ شاہِ اودھ کی ملاقات۔ ممبران پارلیمنٹ کے اجلاس میں مقدمۂ سلطنت کے دائر کرنے کے حالات۔ اور اس مقدمہ کی موافقت میں اہلِ یورپ کے خیالات۔ اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے وجوہ مندرج ہیں۔ اخبار برمنگھم ڈیلی کے ایک مضمون میں چونکہ ان شاہی نژاد مہمانانِ یورپ کا ایک خاص واقعہ درج ہے لہٰذا اس کا ترجمہ

ہم نقل کرتے ہیں۔ مرزا ولی عہد اور جرنیل صاحب کو اسی زمانہ میں اور واقعات بھی پیش آئے جو وہاں کے اخبارات میں برابر شائع ہوتے رہے۔ ہر حصۂ ملک انگلستان ان کی زیارت کا آرزومند تھا۔ اور جا بجا وہ بطریق دعوت و ضیافت بلائے جاتے اور ان کے مرتبہ کے مطابق شاہانہ استقبال کیا جاتا۔

برمنگھم روزانہ ۱۴ اپریل ۱۸۵۵ء ولی عہد اور ان کے چچا جرنیل صاحب سہ شنبہ کے روز برمنگھم تشریف لائے۔ ان کا استقبال نہایت شان سے کیا گیا۔ یہ جماعت گریٹ وسٹرن لائن سے سفر کرتی ہوئی تین بجے کے قریب برمنگھم پہونچی۔ اسٹیشن پر پیشوائی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی۔ جس جگہ پر ٹرین رکی وہاں ایک بڑا شاندار شامیانہ نصب تھا۔ سبزے اور گملے وغیرہ سے آراستگی کر کے پلیٹ فارم پر سرخ کپڑا بچھایا گیا تھا۔ مختلف مقامات پر بہت سی جھنڈیاں نصب تھیں۔ اور ایک بڑا شاہی نشان ہوا میں لہرا رہا تھا۔ مجسٹریٹ شہر اور مسٹر ایلڈرمن پار۔ مسٹر ایلڈرمن کٹلر۔ مسٹر ای ایچ کلی۔ مسٹر جی ارکلی مسٹر سی ریٹ کلف اور دیگر شرفا اور اکثر لیڈیاں بھی موجود تھیں۔ جب ٹرین اسٹیشن پر پہونچی ملکۂ کشور جناب عالیہ اپنی گاڑی سے جس میں کہ انھوں نے سفر کیا تھا باہر اتریں اور میجر برڈ نے مجسٹریٹ اور دیگر معززہ حاضرین سے ان کا تعرف کرایا۔ شہزادوں نے سب معزز انگریزوں سے ہاتھ ملایا اور استقبال سے بہت خوش ہوئے ملکۂ کشور اور شہزادے معہ اپنے تمام ساتھیوں کے جن کی تعداد بائیس اشخاص کی تھی گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ دونوں شہزادے اور میجر برڈ اول گاڑی میں سوار ہوئے اور باقی ہمراہی چھ گاڑیوں میں سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ جس وقت کہ گاڑیاں اسٹیشن سے باہر نکلیں مجمع نے خوشی سے نعرے بلند کئے جس سے ولی عہد بہادر اور ان کے چچا جرنیل صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہ جماعت بل اسٹریٹ اور ہائی اسٹریٹ سے گزرتی ہوئی ہن اور رکین ہوٹل پہونچی۔ سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ جب سب لوگ گاڑیوں سے اترے تو پھر مجمع نے خوشی کا اظہار کیا۔

اس وقت شاہی قافلے میں حسب ذیل اشخاص تھے۔

(۱) ابوالنصرت کیوان قدر ہمایوں جاہ قیصر حشمت صاحب عالم مرزا محمد حامد علی بہادر ولی عہد اودھ

(۲) جنرل سکندر حشمت دارام رتبت صاحب عالم مرزا محمد جواد علی بہادر برادر شاہِ اودھ

(۳) ہز اکسلنسی مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر وکیل شاہِ اودھ

(۴) میجر آر ڈبلو برڈ

(۵) جلیس الدولہ مصاحب شاہِ اودھ

(۶) سید محمد جعفر خاں بہادر اُستاد ولی عہد

(۷) حکیم محمد مسیح طبیب ولی عہد بہادر

(۸) مرزا محمد علی استاد انگریزی

(۹) منشی سید اولاد علی سکرٹری ہز رایل ہائینس جنرل صاحب بہادر

(۱۰) مولوی محمد حسین مصاحب جنرل صاحب

(۱۱) کپتان جی آر برانڈن

(۱۲) سید عبداللہ مترجم فارسی

ان کے علاوہ دو چوبدار ایک حقہ دار اور چھ متفرق ملازم تھے۔

اس واقعہ کو خود جنرل مرزا سکندر حشمت بہادر نے بھی اپنے ایک خط موسومہ نواب تاج دار بہو صاحبہ (اپنی بیگم جو لکھنؤ میں تھیں)، میں تحریر فرمایا ہے کہ ۱۲ تاریخ شعبان المعظم ۱۲۷۳ھ کو حسب صلاح ایجنٹ و درخواست باشندگان کے ہم اور برخوردار میرزا ولی عہد بہادر معہ چند ہمراہیوں کے بلدۂ برمنگھم کو جو سو کوس اس شہر سے ہے ریل گاڑی میں تشریف لے گئے اور وہاں کے حاکم نے اترنے کی جگہ تمام فرش قالین کا بچھوایا اور خود معہ عمائد کے استقبال کو آیا تھا اور تمام خلقت وہاں کی ساتھ تھی۔ سب نے تواضع و تعظیم کی۔ یہ شہر بھی ملکۂ معظمہ کے ماتحت ہے اور ایک حاکم وہاں رہتا ہے۔ ہم اپنے مقدمہ کے انتہا کو گئے تھے سو الحمد للہ سب کے نزدیک کمپنی پر ہمارا حق ثابت ہو گیا اور ہمارے حالات کی کتابیں دیکھ کر اخبار والوں نے ہمارے حقوق

کے متعلق مضامین چھاپنا شروع کئے تا قیام ہمارے حاکم نے سواری کے ساتھ رہ کر تمام کارخانہ جات آہنی برنجی چرمی کاغذی اور شیشہ وغیرہ کے دکھلائے۔ تین دن وہاں رہے چوتھے روز سوار ہو کر لندن میں آئے الحمدللہ کہ وہاں کے لوگ سب دوست ہو گئے۔ اور اب گرد و نواح میں اسی طرح جانا ہو گا۔ اور جو حال ہو گا وہ پھر لکھا جائے گا۔

ان تمام اخباروں اور کاغذات سے خاندان شاہی کے حالات کے ساتھ یہ بھی نمایاں طور پر نظر آرہا ہے کہ منشی سید اولاد علی صاحب اس محترم قافلہ کے ساتھ ہر جگہ اور ہر موقع پر کس عزت کے ساتھ موجود رہا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں جو حالت واجد علی شاہ کی کلکتہ میں اور دیگر ارکان خاندان شہریاری کی لکھنؤ میں ہو رہی تھی اس کا ایک معمولی خاکہ ایک خط کے پڑھنے سے نظر آسکتا ہے جس کو محمد اعتماد علی خاں بہادر خواجہ سرا نے ہندوستان سے شہزادہ مرزا اسکندر حشمت جرنیل صاحب بہادر کی خدمت میں انگلستان بھیجا تھا پیش کرنا مناسب جانتے ہیں۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق فارسی زبان میں ہے۔ اس قسم کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ راقم کے پیش نظر ہے جس میں بعض مکاتیب نہایت دلچسپ اور ضروری واقعات سے لبریز ہیں اکثر ارکان خاندان شاہی کی طرف سے جرنیل صاحب کے نام ہیں۔ سب نہایت پاکیزہ فارسی میں ہیں اور نہایت خوش خط لکھے ہوئے ہیں لمبے لمبے بندوں پر ہیں جن کی شان مکتوب سی ہو گئی ہے حسب دستور بعض پر مہریں بھی ثبت ہیں۔ خط مندرجۂ ذیل میں منشی میر اولاد علی صاحب کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یہ خط منشی میر اولاد علی صاحب کے کاغذات میں جب وہ ولایت سے وطن تشریف لائے تھے شاہ آباد آیا تھا۔

خط محمد اعتماد علی خاں بہادر بنام شاہ زادہ مرزا اسکندر حشمت عرف جرنیل صاحب بہادر

جناب مستطاب برادر مرشد برحق قبلۂ عالم و عالمیان عادل دوراں، حاتم زماں جرنیل صاحب بہادر دام اقبالہ

عرض یاریاں بارگاہ آسمان جاہ می رساند۔ قبل ازیں علی السبیل التواتر مرة بعد اخرے و کرة بعد اخریٰ

یہ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطنت اودھ کا مقدمہ پیشتر ہی پارلیمنٹ میں داخل ہوچکا تھا اتنی کارروائی بھی ہوگئی تھی کہ حسب قاعدہ اپیل داخل ہونے کی منظوری ہوگئی۔ اور مقدمہ غور و بحث کے لئے ہاؤس آف کامنز میں بھیج دیا گیا۔ مگر ملکہ معظمہ سے ملاقات ہوئے ہفتہ نہیں گزرا تھا اور دوسری ملاقات کا زمانہ نہیں آیا تھا کہ یکایک ہندوستان کے غدر کی خبر آئی۔

بقیہ خط صفحہ گزشتہ۔ لغایتہ دوازدہم شہر رجب المرجب ۱۲۷۳ھ ہجری عرائض خانزادہ نمک پروردۂ قدیم معنوی حالات و واردات جزئی و کلی اینجا برسبیل ڈاک میں بحضور بندگان والاہمت ترسیل یافتہ غالباً کہ بتدریج و توالی بنظر فیض اثر گزشتہ بالیقین کہ براہ بندہ نوازی و قدما پروری باوجوبۂ ہر واحد شقہ جات کرامت رقعات از پیش گاہ والا اجرا یافتہ عنقریب بطور تسلسل شرف اصدار بخشیدہ خانزاد را معزز و ممتاز فرمایند در آمد میل از تحریرات ہمراہیان لشکر فیروزی اثر خصوصاً میر منشی اولاد علی کہ مرقوم چہاردہم جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ ہجری بود بوضوح پیوست کہ بتاریخ ہفت دہم ماہ فروری مقدمہ بمجلس بورڈ آف کنٹرول کہ محکمۂ وزارت است بعد ملاقات یک دیگر پیش خواہد شد و کچہری ارباب پارلیمنٹ وا گردید باستماع ایں نوید فرحت جاوید ہمیں بیت بر زبانم آمد ؎

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

کہ ایں مژدہ آسایش جانِ ماست

حضرت ارحم الراحمین بتصدق ائمۂ معصومین صلواۃ اللہ علیہم اجمعین دریں بین درستی سلطنت بحیلہ وجوہ فرمودہ بندگاں والا را با فتح و فیروزی بہ بیت السلطنت ساختہ باشد بر ڈیوڑھی سرکار عرش وقار من جمیع الوجوہ خیریت است۔ نصیب اعدا مزاج بندگان حضور بیگم صاحبہ دام اقبالہا بتحریک نزلات دماغی در عافیت وغیرہ کسلے داشت از افضال الٰہی و بمعالجہ خلف مسیح الدولہ بہادر باعتدال تمام است و مزاج شاہزادہ عالی تبار مرزا جہاں قدر بہادر دام اقبالہ بسبب بر آمد دندان فصلین اکثر بد لطف می باشد معہذا چوں تنقیہ دم تا سدا از چسپانیدن زلو زیر بنا گوش وغیرہ چہار رینہ معمولی آمد بفضلِ خدا و ائمہ ہدا طبیعت درست و بعافیت است نواب مرزا صاحب بہادر و نواب شاہزادہ محل صاحبہ (بقیہ بر صفحہ ۳۰)

اور ہر طبقہ میں مشہور ہوگیا کہ بلندی ہند میں بغاوت کی آگ میرٹھ سے لگی تو آناً فاناً کلکتہ کے قریب پہونچ گئی۔ پنجاب سے بنگالے تک سخت خونریزی ہو رہی ہے۔ بغاوت کے صدر مقامات دہلی اور لکھنؤ ہیں۔ اور اگرچہ شاہی خاندان اودھ اور لکھنؤ کے لوگوں کو اس ہنگامہ سے بجز

بقیہ خط۔ نواب زماں آرا بیگم صاحبہ و شرف النسا بیگم دام دولتہما خوش و خرم ہستند و مابقی جملہ متابعین و متعلقین بندگان والا از اندرون تا بیرون صحت و عافیت تمام۔ اندر در جنرل باغ و حیدر باغ بدستور خیریت و ہمہ کاروبار آب پاشی و مرمت وغیرہ جاری است و مزاج اقدس بندگان سکندر شان حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ بصحت و خیریت است و الامغویان و مخربان از اغوا و فتنہ پرداز زیادہ دست را کوتاہ نساختہ اند مگر جناب اعلیٰ بوجہ ورود معروضات طمانیت نامجات حضور پُرنور مطمئن بودہ با وصف اصرار و استبداد نواب گورنر جنرل بہادر از ملاقات احتراز دانکار ردارند چنانچہ فرمان قدر توامان مشعر دلجوئی و تشفی و اطمینان بمژدہ عنقریب رونق افروزی خود بدولت و ورود حضور پُرنور با حصول سلطنت بنام نامی حضور بیگم صاحبہ دام اقبالہا شرف ورود یافت و نواب ملکہ مخدرہ عظمےٰ کہ ہمہ سامان عزیمت مرتب کردہ قصد مصمم بہ تشریف آوری لکھنؤ می داشتند چوں دراں اثنا تحریر والا مشعر اطمینان تمام و عنقریب حصول مرام پیش گاہ جہاں جاہ در رسید ند بندگان معلےٰ ملکہ ممدوحہ را مانع آمدہ فرمودند کہ عرصہ دو یک ماہ ماہمہ ہا بفتح و فیروزی بخوشی و خرمی رونق افزائے لکھنؤ خواہم شد۔ واقعی برائے تخلیہ اماکنہ شاہی از پیش نواب گورنر جنرل بہادر بنام چیف کمشنر بہادر لکھنؤ حکم صادر شد چنانچہ افواہاً تخلیہ جملہ اماکنہ منظور بودہ جہت خالی کردن چتر منزل بودہ بوجوہ حیلہ بہانہ ہوائی ٹیپے انتظامی عذر و تامل نگاشتہ اند و بہمیں سبب از دیگر مکانات ہم دست نکشیدہ ہنوز زین ظلم دراز دارند و ہم در اصطبل چوپڑ والہ بیمائش تعمیر گورہ بارک شدہ است الغرض بدستور حیلہ کار خود جاری داشتہ اند و بتاریخ بست و سوم رجب ۱۲۷۳ھ وقت سہ پہری لارنس صاحب بہادر بعہدہ چیف کمشنری داخل لکھنؤ شدند و خبر است کہ جگلین صاحب بہادر چیف کمشنر لکھنؤ بعہدہ رزیڈنسی حیدرآباد دکن مقرر شدہ اند آفتاب دولت و اقبال از مطلع جاہ و جلال ساطع و لامع باد (بقیہ خط صفحہ آئندہ)

اس کے کہ واجد علی شاہ کے ایک غیر متعارف نابالغ بچے کو انگریزوں کے فوجی باغیوں نے زبردستی اپنا بادشاہ بنالیا اور کسی قسم کا تعلق نہ تھا مگر اکثر اہل رائے کے خیال میں یہی بات جمی ہوئی تھی کہ اس غدر کا اصلی باعث انتزاع سلطنت اودھ ہے۔

اس انقلاب عظیم کے خبر آتے ہی لندن میں یکایک یہ حالت ہوگئی کہ جو لوگ اودھ کی مشرقی ملکہ اور ہندوستان کے شاہزادوں کے لیے آنکھیں بچھاتے تھے وہی اُن کو بدگمانی وخوف کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ہر شخص کو ان مسافران اودھ کی صورت دیکھ کے وحشت ہوتی۔ اپنے عزیزوں دوستوں کے جوش انتقام میں لوگ انھیں غیظ وغضب کے کڑوے تیوروں سے دیکھتے۔ بلکہ بعض کی یہ حالت تھی کہ ہر ہندوستانی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا ارکان پارلیمنٹ اپنی سلطنت ہند کے بچانے کی فکر میں پڑ گئے۔ اور مقدمۂ استرداد سلطنت اودھ کے بارے میں بے پروائی سے کہہ دیا گیا کہ جس ملک کے بارے میں یہ درخواست ہے فی الحال وہ ہمارے قبضہ میں نہیں ہے۔ لہذا اس کی کارروائی ملتوی کی جائے۔ جو معزز شاہی قافلہ فریادی بن کے گیا تھا اس کی ناگہاں یہ حالت ہوگئی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ہر ادنےٰ و اعلےٰ مکان مسکونہ میں بند پڑا تھا اور کسی کو باہر نکلنے کی جرات نہ ہوتی۔ ابتداءً معمول تھا کہ شاہزادہ دل کی ہمراہی رفقا کا کبھی گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تو سیر سپاٹے کو نکل جاتے۔ لندن کے حکام نے اس کو اندیشہ ناک خیال کرکے باضابطہ اطلاع دی کہ فی الحال آپ لوگ باہر نہ نکلا کریں۔ اس لیے کہ سارے اہل انگلستان اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مارے جانے کی خبریں سُن سُن کر برافروختہ اور بے تاب و بدحواس ہو رہے ہیں اور جوش میں بھرے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی جاہل انگریز

(بقیہ خط صفحہ گزشتہ)

عرضی خانہ زادہ نمک پروردہ قدیم

محمد اعتماد علی خاں معروضہ بست وششم رجب المرجب ۱۲۷۳ھ مطابق بست و دوم مارچ ۱۸۵۷ء

مہر: ۱۲۶۳ | محمد اعتماد علی خاں | بہادر

حملہ کر بیٹھے۔

اب شاہزادے اور تمام ہمراہی انتہا سے زیادہ پریشان اور گویا گھر میں قید تھے۔ اپنے مقاصد میں سب کو یاس تھی۔ جناب عالیہ ملکہ کشور کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت مغموم و متفکر بیٹھی رہتیں اور کہتیں خدا ہی کو ہماری کامیابی منظور نہیں ہے۔

اس پر فتن زمانے میں پہلے انگریزوں کے کمال مظلومی سے مارے جانے اور ملک کے ہاتھ سے نکلنے کی ہولناک خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں اور اودھ کے غریب الوطنوں کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو لندن کے لوگ واقعات ہند کے انتقام میں یہاں گھر میں گھس کے ہمیں نہ قتل کر ڈالیں۔ چند روز کے بعد جب انگریزوں کا تسلط شروع ہوا اور باغیوں سے انتقام لئے جانے کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں ایسی شمشیرِ انتقام بلند ہے کہ ہمارے بال بچوں عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی زندہ نہ بچا ہوگا۔

ایام غدر میں انگریزوں نے مناسب جانا کہ واجد علی شاہ کو قلعہ فورٹ ولیم میں رکھا جائے تاکہ باغی فوجوں کے افسروں کی ان تک رسائی نہ ہو سکے۔ اپنی اس قید کا حال خود بادشاہ نے مثنوی حزن اختر میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔ جو راقم کے پاس موجود ہے۔ بادشاہ قلعہ میں مقید تھے کہ غدر بالکل فرو ہو گیا اور انگریزی سلطنت پھر ہندوستان کے سیاہ سفید کی مالک ہوئی۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے ولایت کی کارروائیوں کا افسوسناک انجام اپنے نانا مرحوم منشی قمر الدین صاحب کی روایت سے کہ مولوی مسیح الدین خاں کا پورا دفتر ان کے سپرد تھا اور وہ ان کے ہمراہ ولایت گئے تھے اور بڑے متقی و صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ اپنے رسالہ دلگداز بابت ماہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں شائع کیا ہے کہ لکھنؤ کا غدر فرو ہو گیا تو مسیح الدین خاں نے جو لندن میں بادشاہ کے مختار عام تھے پھر اپنا دعوےٰ پیش کیا انھیں بادی النظر میں کامیابی اور استرداد سلطنت کی پوری امید تھی۔ مگر بدقسمتی سے ان لوگوں میں جو قلعہ میں بادشاہ کے مشیر اور مصاحب تھے

خواہ کسی بیرونی تحریک سے یا خود اپنے نفع کے خیال سے ایک سازش ہوئی۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر مسیح الدین خاں مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور روپیہ رہ جائے گا۔ لہٰذا سب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ جہاں پناہ بھلا کبھی کسی نے ملک سے کے دیا ہے مسیح الدین خاں نے حضور کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ ہوتا ہوانا کچھ نہیں ہے۔ اور جہاں پناہ مفت میں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال سے تنخواہ نہیں لی ہے۔ ہر بات کی تنگی ہے اور ہم ملازمانِ دولت بھی پیسہ پیسہ کو محتاج ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ حضور گورنمنٹ انگریزی کی تجویزوں کو قبول کرلیں اور تنخواہ وصول کر کے اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلات عالیات اور آستاں بوسان دولت کے ساتھ بسر فرمائیں۔ بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی اور بادشاہ سے زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے۔ مصاحبوں نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو انھوں نے بلا تکلف ویسرائے کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ مجھے سرکار انگریزی کی مجوزہ ماہوار لینا منظور ہے۔ لہٰذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے اور مقدمہ جو لندن میں دائر ہے خارج کیا جائے۔ جواب ملا کہ اب آپ کو اوّل تو گزشتہ ایام کی ماہوار نہ دی جائے گی۔ صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہوگی۔ دوسرے فقط بارہ لاکھ روپیے سالانہ دیے جائیں گے اور جو تین لاکھ روپیہ آپ کے ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے۔ اب اُن کے دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بہ ظن غالب بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے مگر مصاحبوں نے اس پر بھی راضی کر دیا اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان میں اطلاع دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا۔ لہٰذا ان کا مقدمہ خارج کیا جائے۔ بادشاہ کے ماہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن میں پہنچی مسیح الدین خاں کے حواس جاتے رہے بادشاہ کی ماں اور ان کے بھائی اور ولی عہد نے سر پیٹ لیا اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ افسوس اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک میں ملا جاتا ہے۔

آخر مسیح الدین خان نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی اور پارلیمنٹ میں یہ

قانونی عذر پیش کیا کہ بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست میں ہیں اور ایسی حالت میں ان کی کوئی تحریر پایۂ اعتبار کو نہیں پہونچ سکتی۔ عذر معقول تھا تسلیم کیا گیا اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذرداری سے مطلع کر دیا گیا۔ ساتھ ہی مسیح الدین خاں اور تمام ارکانِ خاندانِ شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں ہمیں ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری امید ہے۔ اب غدر فرو ہو چکا تھا۔ گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا۔ اور وہ خوشی خوشی قلعہ سے نکل کر مٹیا برج میں آئے اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبوں نے عرض کیا حضور مسیح الدین خاں لندن میں کہہ رہے ہیں کہ جہاں پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نے برافروختہ ہو کر اسی وقت لکھ بھیجا کہ ہم نے آزادی سے برضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کیا ہے اور مسیح الدین خاں کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید میں ہوتے یا کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے منظوری دی ہے۔ لہٰذا آئندہ کے لئے ہم اس مختار نامہ ہی کو منسوخ کئے دیتے ہیں جس کی رو سے وہ ہمارے مختارِ عام بنائے گئے ہیں۔ اب کیا تھا ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ بادشاہ مٹیا برج میں رنگ رلیاں منانے لگے۔ مصاحبوں کے گھر میں ہُن برسنے لگا۔ اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ جو انگلستان میں پڑا ہوا تھا قریب قریب وہیں تباہ ہو گیا۔ جب بادشاہ نے لندن میں جو بربادی کے واقعات پیش آئے تھے سنے تو اس کے متعلق یہ شعر فرمایا ؎

ہے غم پئے رفتگاں کیسے کیسے
مرے کھو گئے کارواں کیسے کیسے

اراکینِ خاندانِ شاہی کا اکثر ہمراہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ ساری محنت رائیگاں گئی ؎

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

ارکان شاہی کی حالت اور ان کا انجام

اس موقع پر ضرورت ہے کہ خاندان شہریاری اودھ کے شرح حالات بیان کئے جائیں
ان انگلستان کے جانے والوں میں سب کی سرتاج جناب عالیہ تھیں۔ ان کا پورا
خطاب اور نام خاتون معظمہ پادشاہ بیگم ملکۂ کشور فخر الزمانی نواب تاج آرا بیگم
خاص محل تھا۔ امجد علی شاہ اودھ کی زوجہ محترمہ اور پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ ان کے والد نواب
حسین الدین خان بہادر نواب امام الدین خاں کے فرزند دلبند اور وزیر الممالک نواب قمر الدین خاں
بہادر کے پوتے تھے۔ نواب حسین الدین خاں رشتہ میں امجد علی شاہ کے پھوپھا بھی ہوتے تھے
اور ماموں بھی۔ اس لئے کہ محمد علی شاہ کی بہن ولایتی بیگم ان کو منسوب تھیں۔ اور محمد علی شاہ
بن نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں فرماں روائے اودھ کو نواب حسین الدین خاں کی بہن
ممتاز الزمانی نواب جہاں آرا بیگم ملکۂ آفاق بیاہی تھیں۔ خلاصہ یہ کہ محترمہ خاص خاندان شاہی
سے تھیں۔ اس لئے کہ ان کی مادر محترمہ کو شاہزادی ہونے کا فخر حاصل تھا۔ آپ کے بطن سے
اوّل (واجد علی شاہ) اور پھر شاہزادۂ مرزا سکندر حشمت پیدا ہوئے۔ ان کے بعد نواب
اشرف النساء بیگم عرف افسر بہو کی پیدائش ہوئی۔ ان شاہزادی صاحبہ کا عقد نواب سرفراز الدولہ
ابن نواب منیر الدولہ بہادر کے ساتھ ہوا۔ جو نواب روشن آرا بیگم بنت محمد علی شاہ کے فرزند
اور امجد علی شاہ کے حقیقی بھانجے تھے۔ الغرض جناب عالیہ کوئی معمولی خاتون نہ تھیں بلکہ خاندان
شہریاری سے تھیں اور سلطنت و امارت کے آغوش میں پلی تھیں۔ شرافت نسبی کے علاوہ خدا
نے صاحب عقل و فراست پیدا کیا تھا۔ وہ اور ان کی خوشدامن ملکۂ آفاق جو رشتہ میں ان کی
پھوپھی ہوتی تھیں خاندان شاہی کی بڑی صاحب رائے بیویوں میں شمار کی جاتیں۔ ہمیشہ امورِ
حکمرانی اور اہم و نازک معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا۔ اور ان کی رائے پر عمل ہوتا چنانچہ
نواب امین الدولہ ذوالفقار جنگ کی وزارت میں جب پیچیدگی پیدا ہوئی تو انھوں نے امر

معاملہ کو بھی ان ہر دو بیگمات کی خدمات میں رجوع کیا تھا اور انھوں نے جواب با صواب ارشاد فرمائے تھے[۱] اور جس وقت انتزاع سلطنت کا حکم صاحب رزیڈنٹ نے یک بیک آکے سنایا تو جناب عالیہ نے چلمن کی آڑ سے ان سے ایسی گفتگو کی اور اپنے فرزند کی طرف داری میں ایسے معقول و موجہ دلائل پیش کئے کہ صاحب عالی شان دنگ رہ گئے۔ اور اسی طرح لندن میں پہونچ کر انھوں نے ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے سامنے ایسی تقریر کی کہ ملکہ معظمہ کے دل پر بہت بڑا اثر پڑا۔ آغاز گفتگو میں ملکہ معظمہ نے مزاج پرسی کے سلسلہ میں پوچھا۔ یہاں کی آب و ہوا آپ کے مزاج کے موافق ہے۔ جواب دیا نہ تھی تو بھی آپ کی زیارت کی مسرت نے موافق بنا دیا جس کی مدت سے تمنا تھی[۲] قیام انگلستان میں نہایت ملول و حزیں رہیں۔ تھوڑی بہت امید مسرت پیدا ہو چلی تھی کہ غدر کے ہنگامے نے پریشان کر دیا جس کی کوفت ہر وقت دل پر رہتی۔ پھر جب واجد علی شاہ نے گورنمنٹ انگریزی کے شرائط منظور کرکے تنخواہ لے لی تو ساری تمنائیں خاک میں مل گئیں۔ اور ارادہ کر دیا کہ اس سرزمین کو فوراً چھوڑ دیں اور عتبات عالیہ کی زیارت کرتی ہوئی گھر آئیں۔ اس غرض سے بیٹے اور پوتے دونوں کو لندن میں چھوڑا اور خود اپنے ہمراہیان خاص کو لے کر ملک فرانس میں پہونچ کر وہاں کی دار السلطنت پیرس میں ٹھہر گئیں۔ یہاں سے عتبات عالیات کی طرف سفر کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ بیمار پڑ گئیں۔

---

[۱] ۔ امجد علی شاہ کے عہد میں جب وزارت کا انتخاب ہوا تو نواب ملکۂ آفاق کی رائے نواب معین الدولہ کے متعلق یہ تھی کہ ان کو وزارت دی جائے اور اگر بالفعل یہ عہدہ نہ دیا جائے تو سفارت کے منصب پر سرفراز کیا جائے مگر امجد علی شاہ نے اس وقت نواب معین الدولہ کو مہمات سلطنت کا مشیر بنایا اور ان کے بیٹوں کو نظامت خیرآباد و رسالہ سوار وغیرہ عنایت کی۔ لیکن اس کے تھوڑی مدت کے بعد وہ اسباب پیش آئے کہ نواب معین الدولہ کو بادشاہ نے خلعت وزارت سے سرفراز فرمایا اور جناب عالیہ کی سفارش اور ملکۂ آفاق کی رائے صائب اور مفید ثابت ہوئی۔

[۲] ۔ لندن کے قیام میں اکثر خاندانی معزز میمیں آپ سے ملنے آتیں اور وہ آپ سے مل کر خوش جاتیں اور حسن اخلاق کی آپس میں تعریف کرتیں۔

پیرس کے اخبار اِل لُوسترا سیون فرانسز نے اور لی دیر سال نے آپ کے ورود کے ساتھ آخر تک کے حالات بہت تفصیل سے شائع کئے ہیں۔ اخبار مذکور کے اوراق میرے پاس موجود ہیں جن کو مولوی مسیح الدین خاں صاحب اپنے ہمراہ لائے تھے۔ میں نے کانپور کی ایک لیڈی پروفیسر سے ان کا ترجمہ انگریزی میں کرایا اور اس سے اردو میں ترجمہ کرا کے نذر ناظرین کرتا ہوں۔ فرانسز مذکور میں لکھا ہے۔

جناب عالیہ ۲۱ جنوری ۱۸۵۸ء کو ایک بجے دن کے لندن سے پیرس تشریف لائیں۔ ان کے ملازم کہار ایک شاندار پالکی میں انھیں اسٹیشن سے ہوٹل میں لائے۔ چونکہ ایک غیور طبیعت کی خاتون تھیں لہذا جب اندیشہ ہوا کہ میری زندگی کی آخری گھڑی کہیں ایسی سرزمین پر نہ آجائے جہاں مجھے اپنے مقاصد میں ناکامی نصیب ہوئی تھی تو انگلستان میں رہنا پسند نہ کیا اور پیرس میں چلی آئیں۔ یہاں آتے ہی یوم یک شنبہ ۲۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو ایک بجے دن کے مس پیپی کی گود میں انتقال کیا۔ وہ ایسی نیک اور فیاض ملکہ تھیں جملہ خورد و بزرگ کو ان کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ان کی وفات سے تمام لوگوں کو سخت صدمہ ہوا۔ معتشم الیہا کو ایک عورت سے جو اُن کی خاص مقرب خادمہ تھی نہایت انس تھا۔ یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ لندن سے روانہ ہونے کے دو ہی چار روز پیشتر اس نے سفر آخرت کیا۔ اس کی ایک چار پانچ سال کی بچی سے جناب عالیہ کو دلی الفت تھی جس کا نام کنیز حسین ہے۔

معتشم الیہا کے ہمرکاب پچاس آدمی تھے جن میں سے اٹھارہ عورتیں تھیں۔ ہمراہیوں میں سے چند مخصوص لوگوں کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) مولوی محمد حسین صاحب مجتہد (۲) نواب جلیس الدولہ بہادر مصاحب واجد علی شاہ اودھ (۳) نواب مہدی قلی خاں بہادر جو نادر شاہ شہریار عجم کی نسل سے ہیں۔ (۴) جرات علی خاں بہادر نواب ناظر یعنی خواجہ سراؤں کے افسر اعلیٰ۔ (۵) میاں خورشید علی خاں خواجہ سراؤں کے افسر دوم۔ (۶) میر دلاور علی مددگار سکرٹری۔ (غالباً فرنچ اخبار میں

نام کی غلطی ہوگئی ہے میر دلاور علی کی جگہ میرا ولاد علی پڑھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ یقیناً ہمرکاب تھے اور دلاور علی کسی صاحب کا نام معروف نہیں ہے۔ ہمراہیوں میں نہیں سُنا گیا۔ ہز رائل ہائنس شاہزادے بہادر تشریف لائے تو ان کے ہمراہ سید عبد اللہ نام ایک عجمی النسل بزرگ تھے اور ہندوستانی سنسکرت، عربی اور انگریزی خوب بولتے تھے۔ اور ترجمان کی حیثیت سے ساتھ آئے تھے۔

دوشنبہ کے دن ۲ بجے رات کو جناب عالیہ کی لاش پہلی منزل کے صحن میں لائی گئی۔ اس وقت کثرت سے مشعلیں روشن تھیں اور آگ بھی جلائی گئی تھی۔ حفاظت کے لیئے لاش کے گرد ایک گارد مقرر کر دیا تھا جو رات بھر پہرہ دیتا رہا۔ جب تمام حاضرین اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ لئے تو عورتیں لاش کے پاس آگئیں۔ اور چاروں طرف سے پردہ کر دیا گیا۔ لیکن اس پر بھی باہر سے کچھ کچھ نظر آسکتا تھا۔ پہلے لاش ایک ڈھالو تختہ پر رکھی گئی اور کپڑے جو جسم پر تھے اتارے گئے۔ مٹی کے کورے گھڑوں میں پانی بھرا ہوا تھا جس سے لاش کو غسل دیا گیا۔ پھر ایک معطر عرق منھ میں ڈالا گیا ۔۔۔۔۔ اور آنکھیں ایک سرخ کپڑے سے ڈھک دیئے گئے۔ اور شاہی مہر لگائی گئی۔ بعد ازاں ہندوستانی طرز پر اور ایشیائی و اسلامی رسوم کے مطابق جنازہ بنا کے تیار کر دیا گیا جب تمام رسموں کے بعد کفن پہنا کے لٹائی گئیں تو معلوم ہوتا تھا کہ جناب عالیہ آرام فرما رہی ہیں۔ گہری نیند میں ہیں اور اپنے پیارے فرزند کے رو رو کر پکارنے پر جاگنے ہی کو ہیں جس وقت جنازہ تیار کیا گیا تھا خادمہ عورتوں نے ادب کی راہ سے جوتے اور کپڑے اُتار ڈالے تھے۔ اور برف کے ایسے ٹھنڈے پانی سے غسل دے رہی تھیں۔ برہنہ پائی اور تمام گرم کپڑے اُتار ڈالنے کے باعث یہ عورتیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اور ان کی زندگیاں بھی خطرے میں نظر آتی تھیں۔ اس لئے کہ اس وقت مقیاس حرارت صفر سے چھ سات درجے نیچے تھا۔ سردی میں ایسی جاں نثاری و ادب سے کام کرنے کی مثال یورپ میں نہیں مل سکتی۔

اتوار ہی کے دن یعنی جس روز انتقال ہوا شاہزادہ میرزا سکندر حشمت کو تار دیا گیا۔ اور سہ شنبہ کے دن وہ لندن سے پیرس میں آگئے۔ یہ خوبصورت اور قد آور جوان ہیں۔ موچھیں بڑی بڑی

ہیں۔ نہایت ہی بیش قیمت لباس زیب بدن ہے اور اکثر شاہی وکیل مولوی مسیح الدین خاں سے باتوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف متعدد کتب [illegible] ان کی ایک [illegible] تصنیف (اودھ و شاہانِ اودھ اور گورنمنٹ) ہے۔ مگر وضع نہایت سادی اور مزاج میں بے حد انکسار ہے۔ اگر قیمتی شاہی لباس نہ پہنے ہوں اور پیٹی میں شاہانہ علامات نہ پہنے ہوں تو صرف صورت دیکھ کر کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ کتنے بڑے جلیل القدر بزرگ ہیں۔ جو لوگ جنازے کے جلوس میں شریک تھے انھوں نے مولوی صاحب کو دیکھا ہوگا کہ سر پر عمامہ باندھے ہوئے ہیں۔

منگل کا دن مختلف گورنمنٹوں کے سفارت خانوں سے مراسلت کرنے میں گزرا کہ وہ لوگ آکر جناب عالیہ کے جنازے کی مشایعت کریں۔ بدھ کے روز ۲۔ بجے جنازے کے جلوس کا پورا انتظام ہوگیا۔ شاہزادے سکندر حشمت مع اپنے ارکین دولت کے اپنے کمرے سے اُتر کے نیچے آئے اور جنازے کے پاس گئے۔ فوراً تمام ہندوستانی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مذہبی مراسم بجا لائے گئے (یعنی نماز جنازہ ادا ہوئی)، اس کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ لاش ایک لکڑی کے سفید صندوق میں تھی جس میں پہلے بہت گدگدہ فرش روئی کا بچھا تھا۔ اور صندوق کے اوپر سفید سادی چادر تھی جس کے اوپر دوسری سرخ ریشم اور کلابتون کے کام کی زرچوبی چادر ڈال دی گئی تھی۔ صندوق میں آگے پیچھے چار ڈنڈے لگے تھے جن پر مخمل منڈھ دیا گیا تھا۔ انھیں ڈنڈوں کو پکڑ کے آٹھ شخصوں نے جنازے کو اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ اس گاڑی میں چھ گھوڑے جتے ہوئے تھے جن پر سیاہ پوششیں پڑی تھیں۔ اور کوچ مین کا لباس بھی سیاہ ماتمی تھا۔ جنازے کی گاڑی کے آگے آگے ایک مجتہد صاحب دوسری گاڑی میں بیٹھے کچھ پڑھتے جاتے تھے۔ جنازے کی گاڑی کے پیچھے شاہزادہ محمد جواد علی خاں بہادر دونوں ہاتھوں کو خداوند عالم کی درگاہ میں اٹھائے ہوئے پیدل چلے جا رہے تھے۔ ان کے داہنی جانب مسٹر آرگھی اور بائیں طرف کیپٹن لانج تھے۔ شاہزادے اور ان کے تمام ساتھیوں نے جنازے کی گاڑی

اور جلوس کے پیچھے پیچھے سارا راستہ پا پیادہ طے کیا۔ اور ان کے پیچھے بارہ ماتمی گاڑیوں میں مختلف لوگ تھے۔ دوسری سلطنتوں کے سفیر بھی جناب عالیہ کے جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گئے اور بہت سے لوگ بھی آ گئے تھے جن کے باعث جنازے کے ہمراہ بہت بڑا مجمع ہو گیا تھا۔ یہ ایشیائی پہلی ملکہ ہیں جو اس سرزمین میں دفن ہوئیں۔ ٹرکی سفارت خانے کے متعلق ایک مسجد ہے اسی کے صحن میں آپ آغوش لحد کے سپرد کی گئیں۔ قبرستان پہونچ کر شاہزادۂ مرزا سکندر حشمت کے ہمراہی ان کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جب کہ شاہزادے صاحب نے اپنے قیمتی تاج اور جوتیوں کو اتار ڈالا تھا اس موقع پر مجتہد صاحب نے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں پڑھ کے جناب عالیہ کی روح کو بخشیں۔ پھر شاہزادے بہادر ایک مقام پر بیٹھ گئے تمام رفقا ان کے گرد بیٹھے اور شاہزادے صاحب جناب عالیہ کے اکثر گزشتہ حالات بیان کرنے لگے۔ بار بار والدۂ مشفقہ کو یاد کرتے اور ان کے واسطے درگاہِ رب العزت میں دعائیں مانگتے

انھیں باتوں میں آفتاب غروب ہو گیا اور سب خاموش تھے۔ اس لئے کہ اب تابوت قبر کے کنارے پہونچایا گیا۔ دو شخص قبر کے اندر اُترے اور جناب عالیہ کی لاش کو صندوق سے نکال کر قبر کے اندر رکھا دیا۔ مرزا سکندر حشمت نے قبر میں جھانک کے اپنی والدہ کا آخری جلوہ دیکھا اس کے بعد اس پر ایک تختہ بچھا کے لاش چھپا دی گئی۔ اور مٹی دے کر کف افسوس ملتے ہوئے واپس آئے۔ مرزا سکندر حشمت بعد قبرستان سے واپس آ کر اپنے کمرے میں اکیلے رہے۔ اس قدر ملول و حزیں تھے کہ کسی کو پاس جانے کی جرات نہ ہوئی۔ مگر اس اندوہ و ملال میں بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوئے۔ چنانچہ پیرس سے واپس جاتے وقت انھوں نے مس پیپن کو ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی شال عنایت فرمائی۔ دو شنبہ ۲۷ فروری ۱۸۵۸ء کو آدھی رات کے وقت مع کل ہمراہیان کے لندن روانہ ہو گئے۔ مرزا ولی عہد بہادر مارچ کے مہینہ میں پیرس آنے والے ہیں۔ جن کی عمر ابھی صرف اٹھارہ سال کی ہے۔ اور ان کے والد شاہ اودھ کا سن اس وقت چھتیس برس کا ہے۔

فرانسیسی اخبار میں جو کچھ شائع ہوا اسی قدر ہے۔
دیگر تاریخوں میں ہے کہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ کو رحلت کی اور جناب عالیہ کی عمر ۵۴ برس
تھی۔ اور مرض الموت روحانی صدمہ تھا۔ واجد علی شاہ نے مثنوی حزنِ اختر میں یہ سانحہ نظم
کیا ہے مگر بجائے چون سال کے پچپن برس کی عمر تحریر کی ہے۔ اشعار مثنوی حزن اختر مصنفہ
حضرت سلطانِ عالم ؎

کہ اک دفعۃً آیا لندن سے خط	لکھا غم کا مضمون تھا اس نمط
مری والدہ تھیں جو عصمت مآب	وہ جنت کو راہی ہوئی ہیں شتاب
لکھوں ماں کا سن میں بصد بیم و یاس	گئے سال تھے پانچ اوپر پچاس
وہ دن بدھ کا ایسا قیامت ہوا	کہ مجھ دل جلے پر وہ آفت ہوا

انتقال کے تیسرے دن وہ قبر میں دفن کی گئیں۔ یہ امر تمام حاضرین کے دلوں کو چاک
کر رہا تھا کہ ملک اودھ کی ایک خانماں برباد ملکہ کمال بے کسی و غریب الوطنی کی حالت میں اپنے
وطن سے ہزاروں کوس کی مسافت پر لقمۂ زمین بنائی جاتی ہے۔ بعض طباع لوگوں نے الفاظ
ملکہ مغفرت مآب سے سنہ وفات نکالا۔ راقم کی فرمائش سے پرنس مرزا ثریا قدر بہادر
نے جو شاہزادۂ سلیمان قدر بہادر کے فرزند اور سلطان عالم واجد علی شاہ کے بھتیجے و داماد ہیں
یہ قطعہ جناب عالیہ کی رحلت کے متعلق تصنیف کر کے عنایت کیا۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے اور اس
میں شک نہیں کہ شاہزادہ صاحب ممدوح کو علمی قابلیت کے ساتھ تاریخ گوئی میں خاص مشق و کمال حاصل ہے۔

قطعہ تاریخ وفات جناب عالیہ متعالیہ ملکہ کشور والدہ ماجدہ حضرت محمد واجد علی شاہ مغفور بادشاہ پنجم ملکِ اودھ

مثل دارا جس گھڑی ملکِ اودھ جاتا رہا	اپنی اپنی جا ہر اک تھا فکر و غم سے پائمال
شہر میں فتنہ بپا تھا تب جنابِ عالیہ	سوئے لندن جا کے ہو اس باب میں کچھ قیل و قال

مال جو وکٹوریہ سے جا کے مطلب کو گئیں ملک تا واپس ملے شاید ہوا دل میں خیال
اور دینے کے لیئے اُن ملکۂ موصوفہ کے لے لیئے ہمراہ اپنے تحفہ ہائے بے مثال
تھے وہ از قسمِ جواہر بیش قیمت بے نظیر غرق دریا میں ہوا وہ بکس جس میں تھا وہ مال
یا چرایا خادمہ نے ڈوبنے کو کہہ دیا سانحہ گانٹھ آپس کی ایسی تھی نہ ابھرا پھر وہ مال
ہر طرف سے صدمہ ہائے و مصائب کا ہجوم کر دیا جس نے دماغ و قلب کو اضعف کمال
بے کسی و بے بسی یاس و الم فکر و قلق ہر گھڑی ایذا رساں جس کے سبب سے جی نڈھال
حالت غربت میں آخر کو قضا فرما گئیں اور کل پس ماندگاں کو دے گئیں بے حد ملال
حسب خواہش صاحب تالیف یک مدت کے بعد اب مجھے پیدا ہوئی جو فکر سالِ ارتحال
ہاتفِ غیبی نے ناگاہ اسے ثریا دی ندا تجھ کو کیوں تشویش ہے ان کا ہوا اچھا مآل

لکھ قلم برداشتہ یوں مصرعِ تاریخ اب
ملکہ کشور قابضِ ملکِ جناں ہیں لازوال

جرنیل صاحب مرزا سکندر حشمت اگرچہ توانا و تندرست تھے مگر گزشتہ ناکامی کے صدمہ پر یہ سخت چوٹ لگی تو ایسے بے تاب ہوئے کہ اسی دن بیمار ہو گئے۔ پیرس سے فوراً لندن کو واپس آئے اور بستر علالت پر پڑ گئے علاج شروع کیا گیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ غرض جاں بر نہ ہو سکے۔ ۱۰ رجب ۱۲۷۴ھ مطابق آخر فروری ۱۸۵۸ء مذکور کو اسی غربت کی حالت میں وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انتقال کے وقت صرف ۳۰ برس کی عمر تھی اور شباب کا عالم تھا اور ماں کی رحلت کو صرف ایک ماہ کا زمانہ گزرنے پایا تھا۔ ۲ مارچ ۱۸۵۸ء لندن کے گرینڈ ہوٹل سے ہز اکسیلنسی مولوی مسیح الدین خاں بہادر وکیل ہز مجسٹی شاہ اودھ کی جانب سے معززین و عمائد کے نام اس مضمون کا اشتہار شائع ہوا کہ ہز رائل ہائینس مرزا محمد جواد علی خاں بہادر سکندر حشمت کے جنازے کے ساتھ آپ حضرات شرکت فرمائیں
ابھی تیس سال کی عمر میں انتقال کیا ہے۔ اُن کی آخری وصیت یہ تھی کہ فرانس کی مبارک سرزمین

میں ہمیشہ کے لئے آرام فرمائیں یہاں کے قیانوی و نیک نفس باشندوں نے جناب عالیہ کے جنازے کے دفن کے وقت شاہ اودھ کے خاندان کے ساتھ نہایت ہمدردی ظاہر کی تھی شاہزادے میرزا محمد حامد علی بہادر ولی عہد اودھ سب صاحبوں کے نہایت ممنون ہوں گے کہ جناب ان کے مرحوم چچا کے جنازے میں شرکت فرمائیں گے۔ جنازے کا جلوس جمعرات کے دن دوپہر کے وقت لافٹ ہوٹل سے روانہ ہوگا۔

جرنل صاحب کا جنازہ بھی اس لئے کہ ماں کے پاس دفن کئے جائیں لندن سے پیرس کو لیجایا گیا۔ ان کے جنازے کے ہمراہ عثمانی سفیر حیدر پاشا اور دولت قاچاریہ ایران کے سفیر فرخ خاں اور بہت سے معززین فرانس موجود تھے۔ جن لوگوں نے ماں کے جنازے کے ساتھ انھیں دیکھا تھا اور ان کی خوش روئی و توانائی کے معترف تھے انھوں نے جو یہ منظر دیکھا کہ چند روز کے بعد وہ بھی ماں کے پہلو میں لٹا دیئے گئے۔ تو خون کے آنسو رونے لگے۔ جرنیل صاحب رحلت کے ساتویں آٹھویں دن دفن کئے گئے۔ کیونکہ لندن سے پیرس کو جانا اور حسب دستور فرانس جنازے کے جلوس کا انتظام کرنا اور مذہبی مراسم کا ادا ہونا ان سب کاموں کے لئے اتنے دنوں کا وقفہ ہونا لازمی امر تھا۔ یورپ کے سرد ملک اور پھر سرما کے موسم میں آٹھ دس روز تک لاش مطلق خراب نہیں ہوسکتی۔ سلطانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ نے بھی اس حادثہ کو اپنی مثنوی عزن اختر میں یوں تحریر کیا ہے ؏

رجب کے مہینہ میں آیا یہ خط　　کہ پڑھنے سے جس کے ہوا دل غلط
لکھا تھا کہ بھائی نے بھی کی قضا　　دہم اس مہینہ کی تھی بد بلا
شب جمعہ راہی عدم کو ہوئے　　مرے ہوگئے تنگ سب حوصلے
یہ پڑھا یہ پیٹا کہ غش کر گیا　　یہ سمجھا کہ میں جیتے جی مر گیا

مرے بھائی دنیا میں تھے تیس سال
لحد کی دلہن سے ہوا اب وصال

ان کی وفات کا کیسا اچھا سنہ ہجری کا مادۂ تاریخ **غم دیگر** نکلا حسب فرمائش احقر کے شاہزادے صاحب ممدوح نے جو قطعات تاریخ تصنیف فرما کر مرحمت کئے وہ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

قطعہ تاریخ ارتحال جرنیل سکندر حشمت مرزا محمد جواد علی بہادر برادر رحم بطنی حضرۃ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ پنجم ملک اودھ مصنفہ پرنس میرزا محمد ثریا قدر بہادر

آج کچھ رنگ ہے کل کچھ ہے طلسم عالم — اس کی قایم کبھی رہتی ہی نہیں اک حالت
انقلابات جہاں گردش افلاک سے ہیں — کچھ نئی بات نہیں ہے یہ پرانی عادت
کل تھے شاہان اودھ ملک اودھ پر قابض — حکمراں آج ہیں برطانیہ باصد شوکت
شہ کی محبوسی کا بے وجہ وہ عالم افسوس — شہر میں غدر رعایا کی بری تھی حالت
یاد بھولے سے جب آتا ہی قلق ہوتا ہی — لاکھ روکیں کبھی رکتا نہیں جوش رقت
اُسی ہنگامۂ پرآشوب میں جرنل صاحب — ساتھ مادر کے تھے لندن گئے باصد عجلت
گئے جس کام کو تھے وہ نہ کچھ کام ہوا — آپ نے کی ہے غریب الوطنی میں رحلت
عیسوی سنہ کی ثریا کو ہوئی فکر جو ہیں — آئی گردوں سے مسیحا کی صدائے ندرت

شکل آئینہ تو حیراں ہی وہ از روئے اجل
ہیں جناں میں جری جرنیل سکندر حشمت

۱۸۵۸

ایضاً

جو کہ تھے عم گرامی میرے — خوش مزاج اور بڑے خوش طینت
آپ سے فوج شہی خوف زدہ — جب وہ شیر پہ طاری ہیبت
خوب رو اور قوی الجثہ — قابل دید تھی ان کی صورت

نہ کبھی ترک ہوئے صوم و صلوٰۃ — جانتے فرضِ خدا کی طاعت
جن میں اوصاف یہ ہوں اے گردوں — اُس پہ لازم نہیں تجھ کو بدعت
باپ بھائی نہ پسر تھے نہ عزیز — دور سب پاس تھی یاس و حسرت
اسی حالت میں قضا کر گئے آہ — غیر کے ملک میں بارِ غربت
سالِ ہجری کی ہوئی فکر مجھے — کہا ہاتف نے نہیں کچھ دقت
اے ثریا بصد آہ و افغاں

کہو صد حیف سکندر حشمت
۱۲ ۷۴ ۵

مرزا سکندر حشمت کو نواب منیر الدولہ ابن مرزا ابو طالب خاں بہادر کی صاحبزادی جن کا خطاب ملکۂ دو عالم نواب تاجدار بہو بیگم صاحبہ تھا منسوب تھیں۔ وہ ان کی پھوپھی شاہزادی نواب روشن آرا بیگم بنت محمد علی شاہ کے بطن سے تھیں۔ انھیں کے حقیقی بھائی نواب سرفراز الدولہ بہادر کو جرنیل صاحب کی بہن بھی بیاہی تھیں۔ غرض کہ جرنیل صاحب اور نواب سرفراز الدولہ ایک دوسرے کے سالے اور بہنوئی تھے۔

تاجدار بہو بیگم صاحبہ کے بطن سے جرنیل صاحب کے دو فرزند تھے ایک میرزا جہانقدر محمد واحد علی بہادر دوسرے نواب مرزا بہادر افسوس کہ جب انتزاع سلطنت کے بعد لکھنؤ میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا اور جرنیل صاحب لندن میں تھے یہاں باغی فوج اور انگریزی سپاہ سے سخت لڑائی ہوئی تو گوروں نے مرزا سکندر حشمت کا بھرا گھر جو جنیر منزل کے قریب نہایت شاندار بنا ہوا تھا خوب لوٹا اور انگریزی فوج نے ان کے خاصہ کے گھوڑے بھی سواری کے واسطے کھول لئے۔ اسی جنگ و جدال میں ان کی ڈیوڑھی کی سپاہ زخمی ہوئی اور دونوں فرزند مذکورہ بالا جو اس وقت محل میں تھے انگریزی فوج کے ہاتھ آئے اور ان کو جنرل اوٹرم صاحب نے نہایت خاطر سے رکھا اور بعد رفع فساد غدر کے انھوں نے

بادشاہ کے پاس کلکتہ میں پہونچا دیا۔ نواب میرزا نے تھوڑے ہی دنوں بعد کم سنی میں انتقال کیا۔ میرزا جہاں قدر بہادر نے البتہ اپنے چچا سلطان عالم کے آغوش میں پرورش پا کے ترقی کی اور صاحب اولاد ہوئے۔ واجد علی شاہ نے اپنی صاحبزادی نواب سر پیر آرا بیگم سے جو خاقان محل کے بطن سے تھیں آپ کا عقد کیا۔ شاہی خاندان کے موجودہ ممبروں میں وہ سب سے زیادہ لائق اور ذی اخلاق تھے۔ چودھری نصرت علی صاحب سکرٹری انجمن تعلقہ داران اودھ اور راجہ درگا پرشاد صاحب تعلقہ دار سندیلہ نے راقم کو جناب ممدوح کے دستخطی متعدد خطوط دکھلائے جن سے اعلیٰ درجہ کی قابلیت و شاہی تہذیب ظاہر ہوتی تھی۔ راجہ صاحب کے پاس راقم نے آپ کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ تاج نما ٹوپی جبرا ؤ لباس شاہانہ وضع اور چہرے سے خوب صورتی کے ساتھ نہایت وقار و سنجیدگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ان دونوں رئیسوں نے کلکتہ جا کر شہزادے موصوف کی خدمت میں باریابی حاصل کی اور آپ کے محاسن اخلاق کے نہایت مداح تھے اکثر خصوصیت کے ساتھ خط و کتابت رہتی صد حیف کہ میرزا جہاں قدر بہادر نے بھی جواں مرگ ہی انتقال کیا۔ وفات کا قطعہ جو حضرت میرزا محمد ثریا قدر بہادر نے عنایت کیا وہ درج کیا جاتا ہے ؎

آں معظم اخیِ پاک منش | صدر آرائے بزم اہل نکو
نام چوں میرزا جہاں قدر است | ضو فگن ہمچو مہر او ہر سو
صاحب علم و فضل و خلق و کرم | بود مردِ یگانہ و خوش خو
دفعۃً کرد رحلت آں مرحوم | مرد و زن از غمش کشادہ مو
اے ثریا ز جورِ دستِ فلک | خاطرم شد فگار در پہلو
صدمۂ ماتمش جگر چاک است | جام چشم ز اشک شد مملو

سالِ رحلت ز خلد رضواں گفت
آمدہ سمت رحمت حق راو

صاحب عالم کیوان قدر ولی عہد مرزا محمد حامد علی بہادر

آپ واجد علی شاہ کے منگوے معلے خاص محل سے پیدا ہوئے۔ نہایت ذہین و خوش رو تھے ۱۲۶۵ھ میں حسب آئین شہریاری ملک اودھ کے ولی عہد مقرر کئے گئے ابوالنصرت کیواں قدر ہمایوں جاہ قیصر حشم صاحب عالم ولی عہد مرزا محمد حامد علی بہادر خطاب قرار پایا۔ شاہانہ جشن کے ساتھ ارکان دولت خلعت و انعام سے سرفراز ہوئے۔ پھوپھی کی بیٹی سے عقد ہوا اور ان کا لقب بادشاہ بہو قرار پایا نوجوانی میں اپنے والدین کے ہمراہ لکھنؤ سے کلکتہ تشریف لے گئے اور وہاں سے مقدمہ سلطنت کے واسطے لندن بھیجے گئے۔ ولایت کے دوران قیام میں انگلستان کے مشہور شہروں کی سیر کی اپنی دادی محترمہ اور نامور چچا کی تجہیز و تکفین کے لئے شہر پیرس میں گئے۔ ہندوستان کی آمد و رفت میں مصر کو دیکھا۔ ولایت میں کبھی وہاں کا ذبیحہ نہ کھایا۔ اگر کہیں دعوت میں بلائے گئے تو صرف میوہ جات کھائے گوشت کو ہاتھ نہ لگایا۔ اور باوجود عالم شباب کے اُمور ناجائز سے پرہیز رہا۔ جب لندن میں داخل ہوئے وہاں کے اخبارات نے حلیہ اور وضع کے حالات چھاپ کر شائع کئے۔ (کہ آپ کا قد موزوں تقریباً پانچ فٹ ۶ انچہ کا اور رنگ گندمی آنکھیں سیاہ و روشن۔ بدن متوسط۔ سن اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ چہرے سے فراست نمایاں، پوشاک نہایت نفیس شاہانہ بیش بہا جواہرات پہنے ہوئے) جب ملکہ معظمہ کی ملاقات کو تشریف لے گئے تو چار گھوڑوں کی بگھی پر سوار ہو کر بڑی شان و تحمل سے روانہ ہوئے اس وقت سر پر تاج بدن میں جڑاؤ لباس اور کلغی مروارید کے مالے سے آراستہ تھے۔ جناب عالیہ اور مرزا اسکندر حشمت کا یکے بعد دیگرے جب انتقال ہو گیا اور مشیت ایزدی سے مقدمہ سلطنت برہم درہم ہوا تو لندن سے ہندوستان میں واپس آئے۔ ۲۷ صفر ۱۲۷۶ھ ہجری روز دوشنبہ کو کلکتہ میں جہاز سے اُترے شاہی خاندان و دیگر حاضرین نے استقبال کیا نذریں دیں۔ آپ نے چار بجے دن کے پوشاک سفر بدلی اور بہت جلوس و دھوم سے اپنے والدین کی خدمت میں جو فرطِ محبت

و مسرت سے بے قرار ہو رہے تھے حاضر ہو کر شرفِ ملازمت حاصل کیا۔ انگلستان کے قیام میں انگریزی بولنے میں خاص مہارت حاصل ہو گئی تھی قابل و معزز انگریز آپ کے لب و لہجہ سے خوش ہوتے۔ بعض یورپین آپ کے ملنے کے مشتاق ہوتے۔ مگر بادشاہ کے خوف اور بغیر اجازت کے ملاقات میں تامل کرتے۔ آپ کا حال خود سلطان عالم نے بسلسلۂ اولاد مثنوی حزن اختر میں جو ۱۲۷۷ہجری کو قلعہ فورٹ ولیم میں تصنیف کی تحریر کیا وہ یہ ہے

ملے لفظ کیواں اگر قدر سے | تو ہو نام روشن سوا بدر سے
ولی عہد ہے یہ مرا نونہال | یہی وارد مصرت خوش خصال
برس بیس کا سن ہے اُس ماہ کا | برا سخت ہوا اس کے بدخواہ کا
وہ ذی علم صاحب ہنر ماہ ہے | وہ ایلق ہے بارتبہ و جاہ ہے
صبیہ جو ہے میری ہمشیر کی | ہوا اس سے عقد مہ و مشتری
موخر کرو بادشاہ سے ہو | تو ہو نام اس ماہ کا ہو بہو
یہ ہے لکھنؤ میں تو لندن میں وہ | پلا کرتی تھی میرے دامن میں وہ

یہ میرا پسر ہے محل خاص سے
اُسی ذی حشم سے خوش اخلاص سے

ولایت سے واپس آنے کے بعد پندرہ سال کلکتہ میں رہ کے کئی اولادیں ہوئیں۔ بادشاہ بہو (دختر چھوٹی شہزادی) سے تین صاحب زادے پیدا ہوئے ایک آفاق مرزا محمد نوح بہادر اور دو بچپن ہی میں بعد پیدائش چل بسے۔ دوسری نواب بیگم المخاطب بہ نواب کوکب محل صاحبہ ان کے بطن سے دو صاحبزادیاں یعنی ایک بڑی بیگم جو صغیر سنی میں انتقال کر گئیں۔ اور دوسری نواب دلبند بیگم صاحبہ اور دو فرزند شہنشاہ مرزا ضیاء النصر اور میرزا محمد قرۃ العین بہادر پیدا ہوئے۔ جب آپ کے بڑے بھائی نوشیرواں قدر بہادر جو تمام تر العقل اور مصروع تھے لکھنؤ میں شہید ہو گئے تو ان کی بیگم شہریار بہو سے سلطان عالم نے

لندن سے آپ واپس آ گئے تو آپ کا عقد کرایا تھا۔ ان کے بطن سے بھی ایک صاحبزادی پیدا ہوئی مگر وہ چند روز رہ کر انتقال کر گئی۔ مذکور الصدر منکوحہ محلات تھے اور تین بیگمیں ممتوعہ تھیں پہلی بیگم سے قمر محمد مرزا عرف بڑے مرزا صاحب تھے اور دوسری بیگم سے قمر شبیر مرزا عرف چھوٹے مرزا تھے۔ تیسری ممتوعہ حیدری بیگم سے کوئی لڑکی لڑکا نہیں پیدا ہوا۔ مرزا ولی عہد بہادر کی ایک صاحبزادی کا تاریخی نام خلافت زمان بیگم تھا۔ جن کی پیدائش سنہ ۱۲۸۱ ہجری میں ہوئی تھی۔ آپ کی صاحبزادی نواب دلبند بیگم صاحبہ تا تحریر اوراق ہذا زندہ ہیں بعض حالات ان سے دریافت کرائے گئے۔ انھوں نے از راہِ اخلاق اپنے والد نامدار مرزا ولی عہد بہادر کی تصویر عنایت کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ ولی عہد بہادر کو شعر و سخن کا بھی شوق تھا۔ کوکب تخلص فرماتے۔ آپ کا دیوان سنہ ۱۲[illegible]ھ میں طبع ہو کر شائع ہوا۔ طوالت کے اندیشہ سے صرف چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

نہ اُس کے حسن کا جلوہ تھا چار آنکھوں میں	رہا نظر کی طرح وہ ہزار آنکھوں میں
گیا تھا میں جو گلستاں میں بے ترے اے گل	دکھائی دیتا تھا گلزار خار آنکھوں میں
کبھی ہنسوں کبھی رووں کبھی کروں فریاد	دکھاؤں گردشِ لیل و نہار آنکھوں میں
وہ آج دیکھیے آتے ہیں یا نہیں آتے	بنا تو شوق سے گھر انتظار آنکھوں میں
تمام اہلِ وطن کو تو بھولنا کیسا	حضور پھرتا ہے اجڑا دیار آنکھوں میں
قسم ہے نرگسِ شہلا کی اے گلِ خنداں	تری سی آنکھ نہ دیکھی ہزار آنکھوں میں
ہوا اشارہ سے برباد کوئی کوئی تباہ	ہے گردشِ فلکِ کج مدار آنکھوں میں
یہ وجہ ہے جو نہیں خواب کا خیال آیا	تصور اس کا ہے لیل و نہار آنکھوں میں
غزالِ خواب کو سونے میں صید کرتے ہیں	وہ کھیلتے ہیں ہرن کا شکار آنکھوں میں
وہ نور دیکھوں کہ موسیٰ کو جس سے غش آیا	بصارت ایسی دے پروردگار آنکھوں میں
جو وقتِ نزع تصور رہا ترے آنے کا	تو آ کے اٹکی تھی یہ جانِ زار آنکھوں میں
جو باغبانِ حقیقی نے کی جگہ دل میں	ترا مقام ہے اے گلعذار آنکھوں میں

نہ بھولے گا وہ شب وصل کا بناؤ کبھی　　کھبا ہوا ہے تمھارا سنگھار آنکھوں میں

میں ضبط گریہ سے مرجاؤں گا مگر کوکب
نہ اشک آئیں گے اپنے یہاں آنکھوں میں

ایضاً

مہر و الفت کے طریقے کو بھلا کیا جانے　　ابھی کم سن ہے وہ انداز وفا کیا جانے

اور بیمار مسیحا نے کیئے ہوں اچھے　　مرض عشق کی اے جان دوا کیا جانے

دل ناشاد مرا شکوہ گلا کیا جانے　　ہے جو عاشق وہ بجز شکر خدا کیا جانے

ہے بہ از ملک سلیمان سے کوچہ تیرا　　بادشاہوں کی حقیقت یہ گدا کیا جانے

عمر بھر ہجر میں اے یار گرفتار رہا　　وصل کا یہ دل بیمار مزا کیا جانے

کس طرح آہ بھلا خاک فراہم ہوگی　　کس طرف اڑ کے غبار اپنا گیا کیا جانے

وہ یہ کہتے ہیں نہ کر مجھ سے محبت اتنا　　عشق کہتے ہیں کسے میری بلا کیا جانے

بے چھری روز مجھے ذبح کیا کرتا ہے　　غیر یہ حال ترا یار رہا کیا جانے

کو رہوں غیر کو دیکھا ہو نظر بھر کے اگر　　کیوں ہوا یار مرا مجھ سے خفا کیا جانے

صورت سبزہ بیگانہ ہوا ہوں پامال　　نخل امید مرا نشو و نما کیا جانے

دل مرا بہلے گا جنت میں بتاؤ کیونکر　　حور انساں کی طرح ناز و ادا کیا جانے

نہ بچے گا کبھی بیمار تپ فرقت کا　　وہ مرض مجھ کو ہوا ہے جو شفا کیا جانے

قید گیسو میں ہیں بے جرم ہزاروں عاشق　　حق و باطل کو تری زلف رسا کیا جانے

سوز الفت نہیں ظاہر ہے کسی پر اے بت　　درد جو دل میں ہے وہ غیر خدا کیا جانے

نہ سنے جو کبھی افسانۂ الفت کوکب
پھر بتاؤ کہ وہ حال مرا کیا جانے

تخمیناً عمر پینتیس برس کو پہونچنے پائی تھی اور عین جوانی کا عالم تھا کہ یک سنہ ۱۲۹۱ھ میں دنیا سے

رخصت ہو کر اپنے والدین کے دلِ پرخوں کو داغ دے گئے۔ جنت نشیں لقب پایا۔ اسباب مرگ میں اختلاف ہے۔ آپ کے بھتیجے شہنشاہ بخت محمد اسرائیل علی مرزا صاحب بہادر نے راقم سے فرمایا کہ فصلی بیماری یعنی مرض ہیضہ میں پانچ اسہال اور چار استفراغ سے انتقال کیا مگر آپ کے خسر اور مصاحب مرزا جلال الدین حیدر خاں عرف آغا جو شرف نے جن کی نواسی نواب بیگم آپ کے عقد میں تھیں آپ کو زہر دیا جانا تحریر کیا ہے اور آپ کی جوانمرگی کے حادثہ کو قطعہ تاریخ میں نظم کر کے دیوان میں چھپوایا جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔ راقم کے پاس آپ کی دونوں تصویریں جن میں ایک لندن کے اخبارات نے چھاپ کر شائع کی تھی اور دوسری کلکتہ میں بعد معاودت کھنچوائی گئی تھی موجود ہیں ؎

واقعہ جاں کاہ ہے ماتم خدائی بھر میں ہے	کر گئے مرزا ولی عہد اودھ ہر دل حزیں
صاحب طبل و علم تھے ایسے شہزادے تھے یہ	باج گیر و تاج دار و نوجواں خندہ جبیں
یوسف ملک اودھ مشہور تھے ہر ملک میں	حسن خود کہتا تھا عالم میں نہیں ایسا حسیں
حشر برپا ہے خدائی میں خدا کی ہر طرف	ساری دنیا آپ کے ماتم میں ہے اندوہگیں
نعش جب اٹھی تو ہمراہ جنازہ غل یہ تھا	صاحب عالم چلے ہیں جانب خلد بریں

سلہ۔ اب کی دکن کے سفر میں جب بمقام حیدر آباد مولانا سید علی حیدر صاحب المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر سے جو مٹیا برج میں شاہزادگان اودھ کی استادی پر مقرر رہے تھے راقم کی ملاقات ہوئی اور واجد علی شاہ کا تذکرہ آیا تو انھوں نے مرزا ولی عہد کا وبائی مرض سے انتقال کرنا بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ ولی عہد بہادر کے دو فرزند جن کی چاند سی شکلیں تھیں وہ بھی اسی مرض میں دنیا سے جنت کو سدھارے۔ راقم الحروف کو اسی سفر میں ۵ نومبر ۱۹۲۴ء کو اعلےٰ حضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ شاہ دکن کی خدمت عالی میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور یمین السلطنت سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر اعظم بھی ملاقات کے وقت نہایت عزت سے پیش آئے دو ڈھائی گھنٹہ لطف ہم کلامی رہا۔

پاک دامانی پہ تربت کے فرشتوں نے کہا ‌ ‌ آپ کو رحمت خدا کی آفریں صد آفریں
حسلہ وقصرِ زبرجد حق تعالےٰ نے دیا ‌ ‌ گلشن فردوس میں بھی آپ ہیں مسند نشیں
دیکھتا ہوں آئینہ ہستی کا کس حسرت سے میں ‌ ‌ اس میں لاکھوں صورتیں ہیں میرا اسکندر نہیں
وقت پاکر یہ دغا ان سنے نمک کو روس نے کی ‌ ‌ اک دوا لاکر سفید ان کو دعائیں پہلے دیں
عرض کی تفریح دل کے واسطے پی لیں حضور ‌ ‌ حق تعالےٰ اس کا شاہد ہے وہ پیتے تھے نہیں
وہ دوا آخر انھیں لوگوں نے پلوائی بجبر ‌ ‌ جسم ٹھنڈا ہو گیا فوراً ہوئی نیلی جبیں
دس منٹ میں یوں چراغ زیست ان کا گل ہوا ‌ ‌ بیٹھے بیٹھے مر گئے واللہ لیٹے بھی نہیں
بے اجل رحلت جو کی رتبہ شہادت کا ملا ‌ ‌ لے گئے فردوس میں ہمراہ اپنے شاہِ دیں
دوڑ کر کہتا مجھے بھی ساتھ لے چلئے حضور ‌ ‌ خواب میں بھی صاحب عالم اگر ملتے کہیں
یہ تمنا ہے مجاور آپ کے مدفن کا ہوں ‌ ‌ عمر بھر رگڑا کروں میں لوح تربت پر جبیں
کو رہوں اس روز جس دن میں نہ رووں آپ کو ‌ ‌ زندگی بھر دامن آنکھوں پر رہے یا آستیں
چپکے چپکے روؤ تربت پر نہ اتنا غل کرو ‌ ‌ صاحب عالم بہادر سوتے ہیں زیر زمیں

اے شرف پوچھے سن رحلت تو رضواں نے کہا

صاحب عالم کو حاکم نے کیا جنت نشیں

۱۲ ۹۱ ۱۲

ولایت میں قیام

تمام واقعات مذکورہ منشی سید اولاد علی صاحب کے سامنے گزرے بلکہ بہت سے انھیں کے ہاتھوں سے انجام پائے۔ اس لئے کہ مولوی مسیح الدین خاں صاحب کے بعد شاہزادگان اودھ کے اسٹاف میں ان سے زیادہ لائق کوئی شخص نہ تھا۔ جنرل صاحب کے تمام کام انھیں کے ہاتھوں انجام پاتے۔ مگر ان کی علم دوست طبیعت نے اس مشغولیت اور سخت افکار

و مصائب کی حالت میں بھی انھیں مذاق طالب علمی سے جدا نہ ہونے دیا۔ چنانچہ ہندوستان سے روانہ ہونے کے ساتھ ہی انگریزی زبان سیکھنا شروع کردی کہ جس سرزمین پر اور جس قوم میں جاتے ہیں وہاں کی زبان و معاشرت سے آگاہی حاصل کریں۔ اثنائے راہ اور دوران سفر میں کپتان برانڈن صاحب سے معمولی انگریزی بولنا سیکھ لی۔ سارے دریائی سفر میں انگریزی پڑھتے رہے۔ اور جب لندن پہونچے ہیں تو اس قابل تھے کہ اپنے مطلب کو ادا کرسکیں کل رفقاء ہر مقام اور ہر صحبت میں کسی ترجمان کے محتاج تھے۔ مگر ان کو مترجم کی ضرورت نہ تھی۔ اور چھ ماہ کے اندر انگریزی میں ایسی فصیح اسپیچیں دینے لگے کہ سب کو حیرت ہوگئی۔ پھر جب انگلستان میں کئی سال تک قیام رہا اور انگریزوں سے شب و روز صحبت رہی تو انگریزی کی دقیق ترین کتابوں کے سمجھنے کے قابل ہوگئے۔ ولایت جانے کے بعد سید صاحب کے اردو فارسی مضامین اور انگریزی آرٹکل بارہا انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں چھپ کر شائع ہوچکے ہیں۔ اکثر اوقات بعض سوسائیٹوں میں آپ شریک ہوتے اور صاحبان انگریز آپ کو لکچر دینے پر مجبور کرتے تو آپ تعلیمی یا کسی اور مضمون پر اسپیچ دیتے اور وہ آپ کی تقریر ایسی پرمغز و مسلسل ہوتی کہ ساری مجلس چیرز سے گونج اٹھتی۔ اہل یورپ سید صاحب کی قابلیت و روشن دماغی کے معترف تھے۔ آپ کی خوش اخلاقی و ذہانت کی تائید میں بعض انگریزی اخبار بھی راقم کے پاس موجود ہیں۔ جنرل صاحب کے ہمراہ زمانۂ قیام ولایت میں جتنے زن و مرد تھے۔ ان سب کی تنخواہ کی برآورد یں اور کل حسابات سید صاحب ہی مرتب اور جاری کرتے۔ کسی کو تنخواہ ملتی تو اُن کے ہاتھ سے اور خریداری ہوتی تو اُن کے ذریعہ سے۔ جنرل صاحب کے نام جتنے خطوط جاتے خانگی ہوں یا غیروں کے سب کا جواب وہی اپنے قلم سے لکھتے اور ان خدمات کے معاوضہ میں ان کو دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مصارف اکل و شرب اور دیگر تمام ضرورتیں سرکار کے ذمہ تھیں۔

ایضاً

دار وغہ محمد مرتضیٰ پنج ہزار یک صد و پنجاہ روپیہ تقسیم نمودہ شد دہم دسمبر ۱۸۵۸ء ہم ربیع الثانی ۱۲۷۵ھ پنجشنبہ

صاحب عالم جرنیل صاحب مرزا سکندر حشمت بہادر دام اقبالہٗ

برآورد تنخواہ ملازمین سرکار فیض آثار من ابتدائے صفر ۱۲۷۴ھ لغایۃ آخر جمادی الاولیٰ سنہ الیہ

صمامعہ

عملہ زنانہ ۶ شش چھ نفر مواجب مختلف من ابتدائے صفر المظفر ۱۲۷۴ھ لغایۃ آخر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۷۴ھ

السامعہ

نواب امیر خانم صاحبہ	حاجی خانم	حیدری خانم	امیرن جمعدارنی	حیدری کہاری	دایہ نواب رانی بیگم صاحبہ
عمہ شہر اعا	سا	ما	ماسہ	ماللعہ	مالعہ

عملہ مردانہ سما لسماسہ

محمد مرزا	منشی اولاد علی	مولوی محمد حسین	میاں محبوب علی خاں	کمو خاں
میرزائے انبود پنجو محمد مرزا	اولاد علی ۱۷ آلِ نبی ۱۲ھ	عام	نطاق حب علی بست بر میاں محبوب	کمو خاں

حسو خاں	عباد اللہ	عنایت حسین	حسین بخش فراش	شاہ محمد باورچی
سما	صما	صما	ما	ما
ما	ما	ما ۱۶۰	ماللعہ	ما

رجب خاص تراش	رحیمی گاذر	مجنوں قلعی گر	کریم بخش خاکروب	رمضان کہار نعمت خانہ
مالسہ	ماسہ	ماعسہ	للعہ	للعہ

ان کاغذات میں جو ان کے اعزا کے پاس موجود ہیں مختلف قسم کی تحریریں اور رسیدیں وغیرہ ہیں۔ ایک پندرہ پونڈ کی رسید ڈاکٹر لوئیس کی ہے۔ ایک تیس پونڈ کی ہے جس میں درج ہے کہ بہ جلدوے خدمت ہارلی ہاوس۔ یہ رقم یکم اکتوبر ۱۸۵۵ء کو اور ۲۱ جولائی سنہ الیہ کو

بمقام لندن وصول ہوئی۔ ایک رسید کسی گھڑی کی قیمت ۵۲ پونڈ کی ہے۔ ایک تین سو روپیہ کی کارچوبی رومال کی ہے۔

میرزا سکندر حشمت جرنیل صاحب کی وفات کا جس قدر صدمہ سید صاحب کو ہوا احیطہ بیان سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے قدردان ولی نعمت اور مہربان آقا کا چھوٹنا غیر ممکن تھا۔ آقائے نامدار کو خاک میں سونپا تو دنیا اور علائق دنیا کی ایسی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی کہ وطن اور اہل وطن سب سے دل کھٹا ہو گیا۔ انگریزی کی اعلیٰ قابلیت پیدا کر ہی لی تھی۔ دل میں ٹھان لی کہ بجائے گھر واپس آنے کے انگلستان میں کہیں نوکری کر لیں اور برگشتہ بخت وطن کی صورت نہ دیکھیں۔ چنانچہ اپنے دوست میر عبداللہ صاحب جائسی کے یہاں جا کے قیام کیا۔ یہ کسی کالج کے پروفیسر تھے اور اپنا ملازمت کا ارادہ اُن پر ظاہر کر دیا۔

ناکام و نامراد شاہی قافلہ کی جہاں اور سب بدبختیاں اور بداقبالیاں تھیں وہاں یہ بات بھی تھی کہ باہم سخت نفاق پڑا ہوا تھا۔ میرزا ولی عہد بہادر اور جرنیل صاحب میں لندن پہونچ کے رنجش ہو گئی۔ جس نے علانیہ مخالفت کی صورت پیدا کر لی۔ فتنہ پردازوں نے دونوں طرف لگا کے بجھا کے اختلاف کی نازک صورت پیدا کر دی تھی کہ کلکتہ میں واجد علی شاہ کو خبر ہوئی تو فہمائش کے خطوط بھیج کے چچا بھتیجوں میں صفائی کرائی۔

اب جرنیل صاحب نے انتقال کیا تو انھیں متفنی لوگوں نے میرزا ولی عہد بہادر سے جا کے لگایا کہ آپ کے مرحوم چچا کی کل چیزیں و جملہ نقد و جنس سید اولاد علی کے قبضہ میں ہیں۔ ولی عہد بہادر کا دل جس طرح چچا کی طرف سے صاف نہ تھا ان کے ملازمین سے بھی صاف نہ تھا۔ فوراً مواخذے پر آمادہ ہو گئے اور سید صاحب سے کہا کہ جرنیل صاحب کا جتنا روپیہ اور جتنی چیزیں آپ کے پاس ہیں حاضر کیجئے۔ سید صاحب نے صاف کہہ دیا کہ ان کے پاس جو کچھ تھا آپ لے چکے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ لوگوں نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے

میں نے ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسی سلسلہ میں آپ نے اپنی صفائی کے ثبوت پیش کئے چوں کہ سچے اور نہایت دیانت دار تھے خدائے تعالےٰ نے اس الزام سے بری کر دیا۔

اسی طرح جرنیل صاحب کے ترکہ کی بابت مرزا ولی عہد بہادر اور مولوی مسیح الدین خاں سفیر شاہی سے بے لطفی پیدا ہوئی۔ جس کی تصریح تاریخ سلاطین اودھ جلد دوم صفحہ ۱۶۸ میں یہ مرقوم ہے کہ مرزا ولی عہد نے اپنے چچا کے متروکہ مال پر تصرف کرنا چاہا۔ مولوی مسیح الدین خاں نے عرض کیا کہ حضور مالک ہیں مگر پیشتر حضرت سلطانِ عالم کی خدمت عالی میں اطلاعاً عرض کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ بات ولی عہد صاحب کو ناگوار ہوئی مفسدوں نے موقع پا کر اشتعال دلایا۔ نوبت عدالت کی پہونچی۔ مولوی صاحب نے مختار نامہ بادشاہی پیش کر کے تیس ہزار روپیہ نقد سرکاری خزانہ میں جمع کر دیا اور اس معاملہ کی عرضداشت بادشاہ کی روبکاری میں لندن سے کلکتہ کو بھیج دی۔ واجد علی شاہ نے عرضداشت پر دستخطی حکم تحریر فرمایا کہ جملہ اُمور سفارت میں مولوی مسیح الدین خاں کو میں اختیار دے چکا ہوں۔ ولی عہد بہادر یہ سُن کر ناخوش ہوئے اور پیرس چلے گئے۔ اس کے بعد جب مصر روانہ ہوئے اور لندن سے ہندوستان کی واپسی کا قصد کیا تو کل ترکہ جرنیل صاحب کا ولایت سے کلکتہ ارسال کیا۔ اور ایک تاج مرصع اور تلوار ولایتی اور موتیوں کا لبادہ اپنے واسطے رکھ لیا۔

المختصر اس جھگڑے سے نجات ہوتے ہی سید صاحب کو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی فارسی اردو کی پروفیسری مل گئی اور ساتھ ہی آپ نے یورپ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ذکورہ شاہی قافلہ کے تمام لوگ ہندوستان میں واپس آئے۔ بجز سید صاحب کے کہ آپ نے انگلستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔

ایک غلط فہمی

سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد میر نے سلاطین اودھ کے حالات میں اپنی کتاب

قیصر التواریخ لکھی ہے جو نولکشور پریس میں چھپ بھی گئی ہے۔ اور لوگوں میں مشہور رہے اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میر اولاد علی جو مشاہیر لکھنؤ سے تھے اور جنھوں نے اپنا خطاب فرزند علی خاں لوگوں کے رفع اشتباہ اور رفع مظنہ کے واسطے مشہور کیا تھا وہ اور منشی باقر علی اور شیخ علی امجد و جرات علی خاں اور ہرمزجی پارسی پانچ آدمی چار لاکھ روپیہ دے کر قافلے کی روانگی کے پندرہ دن کے بعد بھیجے گئے تھے یہ لوگ سکندریہ میں معہ خزانہ کے قافلہ شاہی سے جا کر ملے تھے جب یہ لوگ ولایت میں پہونچے تو انھوں نے آپس میں نفاق کرانے کی تدبیر پیدا کر دی۔ جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی تو باقر علی اور ہرمزجی پارسی کلکتہ واپس بلا لئے گئے۔ اس کے بعد جب تسلط و اختیار کلی جرنیل صاحب کا ہو گیا اور شاہی قافلہ میں اختلاف جاتا رہا تو میر اولاد علی مذکور مایوس و ناکام ہو کر کلکتہ واپس آئے اور دستور معظم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر کرنے لگے مگر یہ اس خیال سے راضی نہ ہوئے کہ جو لوگ کلکتہ میں ہیں ان کے دو سو روپیہ اور مجھے لندن کے سفر کے بعد اتنے۔ تاہم حضور عالم علی نقی خاں بہادر کی بیگم صاحبہ کبھی کبھی خرچ کی کفالت فرماتی ہیں۔ مگر بہ نسبت لکھنؤ کے ان کی بہت تکلیف سے گزرتی ہے۔ شاید وہیں انتقال کیا۔

ناظرین کو غالباً شبہ ہو کہ یہ انھیں سید اولاد علی کا ذکر ہے۔ جن کے حالات ہم لکھ رہے ہیں مگر ایسا نہیں۔ یہ دوسرے میر اولاد علی تھے جو سبحان علی خاں کنبوہ کے عزیز اور بندہ علی خاں کنبوہ کے بھائی تھے۔ وہ خاندان شاہی کے ارکان کو لندن میں چھوڑ کے کمال ناکامی سے واپس آ گئے تھے۔ جن سید اولاد علی صاحب کے حالات ہم بیان کر رہے ہیں وہ شاہ آباد کے رہنے والے تھے اور بجائے واپس آنے کے لندن میں رہ گئے تھے۔

ولایت میں عقد کرنا

سید صاحب کا کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہونا بیان ہو چکا۔ مگر جب ۱۸۶۱ء میں

ڈاکٹر ولیم رایٹ ٹرنٹی کالج سے تبدیل ہوکر کیمبرج میں عربی کے پروفیسر اور سریانی کتب کے محافظ قرار پائے تو اس وقت وہاں سے تبدیل ہوکر آپ ڈبلن کے ٹرنٹی کالج میں مشرقی علمی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ اور ایسے لطف و دلچسپی کے ساتھ اور ایسے کمال قابلیت سے اپنے فرائض منصبی بجالائے کہ یونیورسٹی کے اسٹاف کے علاوہ ڈبلن اور اس کے اطراف کے تمام لوگوں میں نہایت ہر دل عزیزی حاصل ہوگئی اور آپ کو بھی وہاں کے قیام میں ایسی دلچسپی ہوگئی کہ گھر آنے کا کبھی نام بھی نہ لیتے۔ شباب کا زمانہ تھا۔ اور ضرورت تھی کہ کسی نیک خاتون سے نکاح کر کے ایک رفیق زندگی بھی پیدا کرلیں۔ وطن میں اپنی برادری ہی کے لوگوں میں میر قاسم علی صاحب کی دختر یعنی میر حامد علی صاحب کی ہمشیرہ کے ساتھ نسبت قرار پا چکی تھی اگر اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ یورپ نہ چلے جاتے تو بہت دنوں پیشتر شادی ہوچکی ہوتی۔ اب ولایت میں آپ کو اس منسوبہ لڑکی کے انتقال کا حال معلوم ہوا اور وطن کی تھوڑی بہت جو کشش باقی تھی وہ بھی تشریف لے گئی۔ تھوڑے زمانہ کے بعد ڈبلن ہی میں علاقہ برکشایر کی شریف لڑکی سے جس کا نام مس ریپ تھا عقد کرلیا۔ ان میم صاحبہ نے اپنی اطاعت وحسن لیاقت سے سید صاحب کو نہایت راضی کیا۔ سید صاحب کو بھی اُن سے بے انتہا محبت تھی چنانچہ نہایت عیش و اطمینان سے زندگی بسر ہونے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد مسز اولاد علی کے بطن سے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام سید صاحب نے اپنی زبان میں ارشاد علی اور ماں نے اپنے مذاق کے مطابق آرتھر رکھا۔ اب سید صاحب کی قابلیت و شائستگی کی جزایر برطانیہ خصوصاً آئرلینڈ میں بڑی شہرت ہوئی کیونکہ فطرتاً نہایت ذکی و طباع واقع ہوئے تھے۔ قابل و نامور استادوں سے تعلیم پائی تھی۔ علم و فضل اپنے خاندان کا قدیم ورثہ تھا۔ اور شاہ اودھ کے بھائی کی صحبت نے آداب شاہی اور اعلیٰ ترین تہذیب و اخلاق سے آراستہ کردیا تھا۔ اکثر نامی گرامی اور معزز انگریز ملنے کو آیا کرتے۔ جن میں سے بعض کے نام اُن کارڈوں کی رو سے جو سید صاحب کے کاغذات میں ملے حسب ذیل ہیں۔ مسٹر گیارسن[1]

یہ دار السلطنت فرانس پیرس میں زبان اردو کے مترجم تھے۔ کیپٹن میڈوز۔ اور مسٹر تھیبپ مسٹر اٹو فرسلنگ۔ مسٹر فنا نیرا و ٹالین۔ مسٹر آرٹی رسالی وغیرہ۔

چند روز کے لئے وطن آنا

جب تیرہ چودہ سال ڈبلن میں تعلیم دیتے گزر گئے تو اتفاقاً سید صاحب کو وطن یاد آیا اور عزیزوں کی یاد نے بے قرار کیا۔ آخر ایک سال کی رخصت لی اور ہندوستان کے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ جب آنے لگے تو کالج کے پرنسپل نے چھ سو روپیہ نقد بطریق سفر خرچ عطا کئے اور بمبئی تک کے لئے ان کے مع ایک خادم کے سفر کرنے کا پاس فراہم کر دیا۔ چنانچہ دسویں شعبان ۱۲۹۶ھ کو سید صاحب جہاز سے بمبئی میں اترے اور اترتے ہی بڑے بھائی سید فرزند علی صاحب کو جو ان دنوں ریاست بھوپال میں افسر الاطبا تھے تار دیا۔ اس زمانہ میں بھوپال تک ریل نہیں آئی تھی۔ اور بھوپال جانے والوں کو اٹارسی اسٹیشن پر جو جی آئی پی ریلوے کے اُس لائن پر جو جبل پور سے بمبئی گئی ہے واقع ہے اترنا پڑتا تھا۔ اور کوہستان بندھیاچل کو قطع کر کے اور ۸۴ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جو نہایت دشوار گزار راستہ تھا بھوپال پہونچنا ہوتا۔ سید صاحب ۱۲ شعبان کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور پندرھویں شعبان کو اٹارسی کے اسٹیشن پر پہونچے۔ وہاں ہاتھی اور سامان باربرداری تیار ملا۔ تھوڑے ہی زمانہ میں بھوپال پہونچ کے محترم بھائی سے ملے اور تقریباً دو ہفتہ بھوپال میں قیام رہا۔ یہاں ہر ہائی نس بیگم صاحبہ اور دیگر عمایدِ ریاست سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی زمانہ میں اتفاقاً حکیم صاحب کو نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کے ہمراہ شرکت دربار کے لئے کلکتہ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ انڈین مڈلانیڈ ریلوے زیر تعمیر تھی اور بھوپال کے قریب ایک اسٹیشن قایم ہو چکا تھا جس سے سواری گاڑیاں تو نہیں جاتی تھیں مگر ریلوے کمپنی اپنے سامان کو مال گاڑیوں کے ذریعہ سے بھیجتی اور منگواتی رہتی۔ سید صاحب نے

بروقت ملاقات بیگم صاحبہ سے کہا کہ اگر صاحب پولٹیکل ایجنٹ چاہیں تو آپ کے سفر کے لیے اس اسٹیشن تک سواری کی گاڑیاں آسکتی ہیں۔ فوراً اس بارہ میں تحریک کی گئی اور صاحب ایجنٹ نے کوشش بھی کی مگر کارگر نہ ہوئی اور جواب آیا کہ ابھی اس لائن پر سواری گاڑی نہیں آسکتی مجبوراً سفر کا ارادہ کردیا گیا اور انتظام کے لئے حکیم سید فرزند علی صاحب پہلے سے روانہ ہوگئے۔ اتفاقاً حکیم صاحب اس جدید اسٹیشن پر گئے اور میر اولاد علی صاحب کو بھی ہمراہ لے گئے۔ اتفاقاً ریل پر ایک معزز افیسر ریلوے موجود تھا۔ اس کو سید صاحب کے حالات معلوم ہوئے تو نہایت تپاک سے پیش آیا اپنے بنگلہ پر لے گیا۔ اپنی میم اور بچوں سے ملایا۔ دیر تک باتیں رہیں اور سید صاحب رخصت ہوکر واپس چلے تو مشایعت کے لئے وہ اس کے بچے سید صاحب کے ہمراہ حکیم صاحب کے خیمہ تک آئے حکیم صاحب نے اُن سب کو بڑی خاطر داشت کے ساتھ بٹھایا۔ کچھ مٹھائی اور پھل بچوں کو کھلائے اور وہ افسر اس برتاؤ سے نہایت محظوظ ہوا۔ اسی موقع پر باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے کہا۔ اگر بیگم صاحبہ کی سواری کے واسطے چند گاڑیاں یہاں آجائیں تو ہم کو بہت آرام ملے۔ صاحب نے کہا کہ یہ کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے اور فوراً تار دے کر گاڑیاں منگوالیں۔ اس کے بعد جب روانگی کا وقت آیا۔ بیگم صاحبہ اسٹیشن پر پہونچیں اور صاحب پولٹیکل ایجنٹ بھی ساتھ آئے تو اسٹیشن پر یہ دیکھ کر کہ فرش وروشنی کا اعلےٰ درجہ کا سامان ہے۔ فسٹ و سکنڈ اور تھرڈ کلاس کی گاڑیاں بیگم صاحبہ اور ان کے رفیقوں کے واسطے موجود ہیں تو صاحب پولٹیکل ایجنٹ کو جو اپنی کوشش میں ناکام رہ چکے تھے حیرت ہوگئی۔ اور جب بیگم صاحبہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سب نتیجہ سید صاحب کی کوشش اور آپ کے اثر کا ہے تو ان کا اور ریلوے افسر کا شکریہ ادا کیا۔ مگر اس واقعہ سے صاحب پولٹیکل ایجنٹ دل میں سخت ناراض ہوئے۔ اتفاق سے سید صاحب نے اپنے واسطے ایک گاڑی علحدہ زر رونڈ کرالی تھی، اور اس کا جداگانہ پاس حاصل کرلیا تھا لیکن صاحب پولٹیکل ایجنٹ کو اس کی خبر نہ تھی اور ان کے خیال میں تھا کہ سید اولاد علی صاحب بھی انھیں گاڑیوں

میں سوار ہیں جن کا کرایہ ریاست کی طرف سے دیا گیا۔ چنانچہ عین روانگی کے وقت صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کی اس دلی کاوش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ صاحب ایجنٹ ریلوے افسر کے پاس گئے اور کہا یہ شخص (میر اولاد علی صاحب) ہمارے ہمراہ نہیں ہے۔ ریلوے افسر نے جواب دیا ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ یہ بیگم صاحبہ کا ملازم نہیں بلکہ اپنے بھائی حکیم سید فرزند علی صاحب کے ساتھ ہے اور سکنڈ کلاس کا محصول ادا کر کے اس نے علحدہ ٹکٹ لے لیا ہے۔ اس جواب پر پولیٹیکل ایجنٹ کو بے حد ندامت ہوئی۔ جب ٹرین الہ آباد پہونچی تو حکیم صاحب بیگم صاحبہ کے ہمراہ کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے اور سید صاحب کانپور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہونچے۔ یہاں دسویں رمضان سے پندرھویں تک قیام رہا۔ اور بعد ازاں شاہ آباد آنے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں شاہ آباد تک ریل نہیں جاری ہوئی تھی لہذا سواری و باربرداری کا بندوبست کر کے شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ سندیلہ میں پہونچے تو راجہ چودھری خصلت حسین صاحب تعلقہ دار سندیلہ سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے کوچ کر کے ہردوئی پہونچے تو چودھری حشمت علی صاحب تعلقہ دار سندیلہ سے ملے۔ چودھری صاحب نہایت خلیق رئیس تھے۔ یہ دیکھ کر کہ بارش کا سلسلہ جاری ہے اپنا ہاتھی دیا کہ سید صاحب کو شاہ آباد تک پہونچا آئے۔ کس لئے گھوڑا گاڑی کے چلنے میں اس موسم میں دشواری تھی۔ اسی طریقہ سے سید صاحب بیسویں رمضان المبارک کو شاہ آباد پہونچے اور سواد وطن میں داخل ہوئے۔ سید صاحب کے ورود سے اعزا و احباب نہایت محظوظ ہوئے۔ اور ساری بستی والے بے انتہا خوش تھے۔ حکام و رؤسا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ شکار و تفریح کے جلسے رہے۔ اسی موقع پر ۲ فروری ۱۸۸۰ء کو منشی میر اولاد علی صاحب نے مدارس علمی کے طلباء و ہیڈ ماسٹر اور افسران و رؤسا کے اصرار پر اسکول شاہ آباد میں تعلیم کے فوائد پر ایک لکچر دیا جس کے سننے کے شوق میں ایک خلقت امنڈ آئی تھی۔ عمایدوطن، ملازمان گورنمنٹ اور سب لوگ جمع تھے۔ اس وقت اسکول شاہ آباد کی رونق قابل دید تھی۔ اس لکچر موسومہ بہ فوائد تعلیم کو پیش

جلسۂ تہذیب لکھنؤ نے چھپوایا بعدہٗ منشی نولکشور صاحب نے سید صاحب سے حاصل کیا اور اس کے ساتھ دوسرے لکچر موسومہ بہ آداب انگلستان کو جو جلسۂ تہذیب لکھنؤ میں آپ نے ہندوستانی و یوروپین اہل علم اور تعلقہ داران اودھ کی خواہش پر بڑی قابلیت سے دیا تھا بہت قدر سے کران دونوں لکچروں کے مجموعہ کا رسالہ ذخیرۂ دانش نام رکھا اور بڑے اہتمام سے نہایت خوشخط سنہرا بیل بنوا کر چھپوایا اور ملک میں شائع کیا۔ اسی سلسلہ میں حکام سررشتہ تعلیم نے ان لکچروں کو مفید و دلچسپ سمجھ کر سید صاحب سے باضابطہ اجازت حاصل کی اور مدارس سرکاری میں طلباء کو انعام میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ راقم نے بڑی کوشش سے یہ دونوں مطبوعہ لکچر حاصل کئے اور ناظرین کی دلچسپی و آگاہی کے لئے لکچر فوایدالعلم یہاں پر جو اسکول شاہ آباد میں تعلیم کے فوائد پر دیا تھا درج کیا ہے۔

تمہید لکچر مصنفہ مولوی میر اولاد علی صاحب شاہ آبادی پروفیسر کالج ڈبلن

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیاً۔ جس وقت بعد مدت چودہ برس کے جذب مقناطیسی محبت اعزہ و احباب کا مجھ کو انگلستان سے جانب ہند کھینچ لایا اور اپنے وطن مالوف قصبہ شاہ آباد عملداری سرکار بادشاہ اودھ میں بعد قریب بتیس برس کے پھر تقدیر لائی۔ اور زیارت بزرگان اور دیدار خردان اور ملاقات احباب سے چشم و دل نے جان تازہ اور مسرت بے اندازہ پائی تو حال ویرانی قصبہ مذکور کا دیکھ کر بہت رنج و ملال ہوا کیوں کہ قریب آٹھ برس کے سن میں راقم اس وطن اصلی سے ہمراہ اپنے اعزہ کے واسطے تحصیل علم کے لکھنؤ آیا تھا اور پھر اتفاق مراجعت بتیس[۳۲] برس تک نہ ہوا ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے آب و دانہ نے لندن کی طرف کھینچا اور راقم جو بعہدہٗ اختیار کل سرکار صاحب عالم جرنیل صاحب مرزا سکندر حشمت بہادر مغفور و مبرور برادر خرد حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ میں ملازم تھا۔ ہمراہ شہزادہ والا تبار مغفور و مبرور کے بمعیت جناب عالیہ متعالیہ والدۂ ماجدہ

حضرت واجد علی شاہ بادشاہ و شاہزادۂ غفران پناہ صاحب عالم مرزا محمد حامد علی ولی عہد بہادر
فرزند بزرگ حضرت بادشاہ اودھ روانہ ولایت ہوا۔ اور وہاں آخر جنوری ۱۸۵۸ء
میں جناب عالیہ متعالیہ اور آخر فروری سنہ مذکور میں جناب شاہزادۂ مغفور و مبرور والد
خرد حضرت بادشاہ نے عالم بقا کو رحلت فرمائی اور بعد اس کے ۱۸۵۹ء میں صاحب عالم
مرزا محمد حامد علی ولی عہد بہادر نے کلکتہ کو مراجعت کی تو راقم کو برائے چندے شہزادہ ممدوح
نے لندن میں چھوڑا کہ بعض امور اُن کے اور ان کے والد بادشاہ اودھ کے ہنوز الجھے
ہوئے تھے اور یقین تھا کہ شاہزادہ پھر لندن کو مراجعت فرمائیں۔ غرض کہ وہ کلکتہ کو آئے
اور آج تک پھر قصد ولایت نہ کیا اور راقم چوں کہ بذات خود وہاں خود مختار رہ گیا۔ اس واسطے
چندے تحصیل انگریزی میں جد و جہد کی اور بعد اس کے بسعی و کوشش مکرمی سید عبد اللہ
صاحب بڑے معزز انگریزی داں اور مدرس لندن یونیورسٹی کے راقم کو عہدہ مدرسی ڈین
یونیورسٹی سے عزت اور امتیاز حاصل ہوا اور وہیں اب تک فضل الٰہی سے ملازم ہوں۔
حکام یونیورسٹی جو حکما اور علما اور فضلائے انگلستان میں منتخب ہیں اس ہیچمیرز پر انتہا کی
عنایت اور شفقت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو عنایت اور رعایت خود اپنے ہم جنسوں سے کبھی
نہیں کی وہ راقم کے حال پر باوجود اختلاف مذہب کے فرماتے ہیں۔ اور عزت و آبرو میں اپنے
برابر رکھتے ہیں۔ اس واسطے آٹھ برس تک برابر بطیب خاطر وہاں رہا اور اسناد انتہائے
خوشنودی اور رضامندی اُن سے حاصل کئے۔ اب برخصت یک سالہ جو ہند میں آیا اور اپنے
وطن مالوف قصبۂ شاہ آباد میں اتفاق قیام ہوا تو ایک روز وہاں کے گورنمنٹ اسکول جا کر
طلبار کا امتحان لیا اور ان کی ترقی علمی دیکھ کر دل خوش ہوا بعد اس کے وہاں کے ہیڈ ماسٹر
بابو جوالا پرشاد صاحب نے درخواست کی کہ ایک لکچر یعنی تقریر تعلیم علم معاش پر جو عام فہم ہو اگر
اس مدرسہ میں دی جائے تو یقین ہے کہ خالی از فائدہ نہ ہو۔ چنانچہ ان کی فرمائش سے راقم نے
یہ جرأت کی اور یہ لکچر فواید علم معاش پر لکھ کر اور ضمن میں کچھ حالات عجائبات لندن کا درج کر کے

رؤسائے شہر کے سامنے پڑھ دیا۔ الحمد للہ کہ اُس کا اثر جلد ظاہر ہوا اور وہاں اور کئی شاخیں گورنمنٹ اسکول کی بڑھ گئیں اور سکنائے شہر کو اپنے لڑکوں کی تعلیم میں تحریص ہوئی۔ یہ لکچر بھی اول صاحبان جلسۂ تہذیب لکھنو نے چھاپ دیا۔ اور من بعد اب مشفقی نولکشور صاحب نے اس کے چھاپنے کی اجازت لی ہے۔ مگر کچھ اس میں بھی بہ نسبت سابق ایزاد کیا گیا ہے اور ترتیب میں تھوڑا تغیر ہوا ہے۔ چونکہ چودہ برس تک اپنے ملک سے دور اور یار و دیار سے مہجور رہا ہوں اور مہارت زبانی بھی[ف۵] اس عرصہ میں اگر جاتی نہیں رہی تو بہت کم ہو گئی۔ پس اگر کوئی خطا سہواً اس تقریر میں ظاہر ہو تو ناظرین باتمکین ذیل عنایت سے اس کو چھپائیں۔ کیونکہ العذر عند کرام الناس مقبول فقط

لکچر

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط مجھ سے میرے مہربان بابو جوالا پرشاد صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ شاہ آباد نے درخواست کی کہ ایک لکچر فواید علمی اور تعلیم پر اس مدرسہ میں دوں جو سننے والوں کو باعث فائدہ کا ہووے۔ اگر ایسا لکچر بابو صاحب موصوف خود عنایت کرتے تو میرے نزدیک بہتر تھا اور مفید تر ہوتا۔ مگر الامر فوق الادب۔ جو کچھ اس وقت میری زبان سے بیان ہو سکے گا کوتاہی نہ کروں گا۔ تعلیم مصدر ہے باب تفعیل سے جس کی اصل علم ہے۔ لغوی معنے علم کے جاننا اور تعلیم کے سکھانا ہیں۔ مگر اصطلاحی جاننا اور سکھانا اُن چیزوں کا جن پر جمیع فوائد دینی اور دنیوی موقوف ہیں۔ علم کی دو قسمیں ہیں۔ علم معاش اور علم معاد۔ علم معاش علم دنیا۔ اور علم معاد علم دین ہے۔

ف۵۔ (از ناچیز ناظم مصنف)۔ اس لکچر کو بھی پچاس برس سے زیادہ زمانہ گزر گیا۔ اس وقت میں اسی قسم کے محاورات تھے۔ اب اردو زبان بدل گئی۔ لہذا لکچر کے ملاحظہ سے ناظرین یہ گمان نہ فرمائیں کہ منشی میر اولاد علی صاحب اردو زبان پر قادر نہ تھے۔ بلکہ وہ فصحائے لکھنؤ میں تھے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ خاندان شاہی کی مجالست میں بسر ہوا جن کی زبان مستند اور مسلم الثبوت تھی۔

یہاں مجھ کو بحث علم معاد سے نہیں کیونکہ علم معاد ہر ملت و مذہب کا جدا ہے اور غرض سب کی اس سے یہی معلوم ہوتی ہے کہ بندہ خوشنودی خدا کی حاصل کرے اور وہ بات کرے کہ جس سے عاقبت بخیر ہو۔ مگر راہیں خوشنودی خدا اور عاقبت بخیر ہونے کی ایسی ہیں کہ ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے کو ملعون سمجھنے لگتا ہے۔ اور خدا کی دوستی کے واسطے بندوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ اور یہی جانتا ہے کہ جنت ہمارے واسطے اور دوزخ سب بندگان خدا کے واسطے ہے۔

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد　　رندے ہمہ دو سالہ ضبطے دارد

معلوم نشد کہ یار مصروف کیست　　ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

جتنے مذہب ہیں اتنے ہی علوم معاد فرض کرنا چاہئے۔ اور علم معاد ایک مذہب کا دوسرے ملت کے کام کا نہیں۔ اور میرا لکچر فائدہ عام کے واسطے ہے۔ اس واسطے علم معاد کو بالفعل خدا کے حفظ و امان میں چھوڑ کر چند کلمات علم معاش کے باب میں لکھتا ہوں۔ علم معاش یعنی علم دنیا وہ ہے کہ جس سے انسان اپنی معاش پیدا کر سکے اور فوائد دنیوی حاصل اور نقصان خود سے دور کرے فقط یہی نہیں کہ اس میں ترقی اور بہبودی نوع انسان کی ہے بلکہ حقائق حیوانات اور نباتات و جمادات سے اور ان کے منافع اور مضرات سے آدمی واقف ہو جاتا ہے تواریخ سے ظاہر ہے کہ جب تک بنی نوع انسان علم معاش سے بے بہرہ تھے حالات اُن کے اور حیوانات کے ایک سے تھے یعنی ننگے مادر زاد۔ پہاڑوں کی کھوہوں میں زمین کے غاروں میں یا جھونپڑوں میں بسر کرتے تھے جنگلی درختوں کے میوے اور صحرائی جانوروں کے گوشت سے پیٹ بھر لیتے تھے اور چمڑے کا لباس بنا کر گرمی اور سردی میں اپنا تن چھپاتے تھے۔ بعض بعض جزیروں میں اب تک ایسے لوگ ہیں جو ننگے رہتے ہیں اور مثل حیوانات کے بسر کرتے ہیں طبیعتیں ان کی علم کے زیور سے آراستہ نہیں اس واسطے خود کو اس حال سے باہر نہیں نکال سکتے۔ ایسے لوگ ملک حبش اور آسٹریلیا میں بہت سے موجود ہیں اور

بدصورت حیوانوں سے کچھ زیادہ کریہ منظر ہیں اور جیسے حیوانات انسانوں کے تابع ہوتے ہیں ویسے یہ جانور بھی اُن انسانوں کے تابع ہیں جو علوم معاش سے ماہر ہیں اور استعداد علمی کے باعث وہ ایسے بہائم کو اپنا مطیع کر لیتے ہیں۔ اب جاننا چاہیئے کہ استعداد علمی کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ ہر قوم میں کوئی نہ کوئی ایسا پیدا ہوتا ہے کہ جس کی عقل کا چراغ زیادہ روشن ہو وہ ایک نہ ایک ایجاد علم معاش میں کرتا ہے اور دوسرے اُس چراغ سے اپنے چراغ روشن کر لیتے ہیں اور چونکہ ہر شخص کی عقل رسا نہیں ہوتی اس واسطے جس کی عقل رسا ہے اُس سے تعلیم قبول کرنا لازم ہوتا ہے اور جب تعلیم ہو گئی تو یہ اسی طرح اپنے اور اوروں کے فائدہ کے واسطے کچھ نہ کچھ پیدا کر جاتا ہے فقط عقل سے اتنی چیزیں نہیں نکل سکتی ہیں۔ جتنی علم اور عقل سے مل کر نکلتی ہیں۔ عقل بجائے خود بادشاہ تنہا ہووے۔ مگر بدون وزارت علم کے اس کا کام انتظام نہیں پا سکتا۔ اور اگر علم بے تعلیم ہو تو وہ مثل اس درخت میوہ دار کے ہے کہ جس کا میوہ کسی کو نہیں ملتا۔ سب برباد جاتا ہے اور جو کوئی باوجود فرصت اور قدرت کے علم نہیں سیکھتا ہے اُس سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آدمی وہ ہے جو جانتا ہے یا سیکھتا ہے باقی سب حیوان ناحق ہیں یعنی یا تو انسان کو علم حاصل ہو یا اگر حاصل نہ ہو تو اُس کی طلب کا شایق رہے۔ اور اُس میں نہ اس میں تو یہ بلا کس میں ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انگلستان کے لوگ مثل جنگلی آدمیوں کے ننگے پھرتے تھے۔ بدن کو رنگتے تھے اور ان ممالک شرقی میں لوگ زیور علم و ہنر سے آراستہ تھے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ مقدمہ بالعکس ہو گیا[1]

ترقیاں ہوئیں ان کو ہمیں زوال ہوئے
وہ بڑھ کے بدر ہوئے گھٹ کے ہم ہلال ہوئے

سبب ان کی ترقی اور ہمارے تنزل کا یہ ہوا کہ وہ روز بروز جویائے علم معاش رہتے

---

[1] یعنی عز

اور جہاں سے جو کچھ حاصل ہو سکا لا کر اپنے ملک میں جمع کیا اور اپنی قوم کو تعلیم علم معاش کی کرنے لگے اور وہ ترقی پاتے گئے۔ اور ہم لوگ روز بروز پیچھے کو ہٹتے گئے یہاں تک کہ خندق میں گرے اور جو کچھ تھا وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا اور جو اہل لیاقت ان میں سے کسی اور ملک میں گئے جب اپنے وطن کو پھر کر آئے تو ہم وطنوں کے واسطے اپنے تجربہ کا عمدہ تحفہ لائے جو کچھ دیکھا سنا تھا اُس سے اوروں کو بھی آگاہ کیا۔ بہتوں نے کتابیں ایسی تصنیف کیں کہ جن سے ان کے تجربہ کی باتیں اوروں کو بھی معلوم ہوئیں اور بعد ان کے بھی ان کتابوں سے ان کی قوم فائدہ اٹھاتی رہی۔ جو جو علوم معاش اور فنون اُن کے کار آمدنی تھے وہ اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے اپنی قوم کو اُس کی تعلیم کرتے گئے اور ہر متنفس کو یہی خیال رہا کہ میری قوم اور ملک کی بہتری ہو۔ سَو برس کے بعد ہو چاہے ہزار برس کے بعد۔ اس سبب سے سب دانہ دانہ جمع کرتے گئے یہاں تک کہ خرمن ہو گیا اور قطرہ قطرہ سے دریا اور انجام اس کا یہ ہوا کہ ملک انگلستان کا اور دوسرے بلاد اور امصار یورپ کے مجمع علوم و فنون ہو گئے اور جو علوم و فنون اور ملکوں سے لائے تھے ان میں نہایت ترقی کی یہاں تک اُن کو مرتبہ بلند حاصل ہوا کہ فرع اپنی اصل پر سبقت لے گئی چونکہ ہم لوگ دوسرے ملکوں میں نہ گئے اور اپنے علوم معاش میں ترقی نہ کی اوروں کے حالات سے عبرت لے کر اپنے حالات کو بہتر نہ کیا۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ ہم اس درجہ کو پہونچ گئے اور جو کوئی آیا اُس نے ہمارا ملک فتح کیا اور جو کچھ ہاتھ لگا لے گیا اور ہم لوگ روز بروز ذلیل اور خوار اپنے ہاتھوں سے تباہ ہوتے گئے۔ اب ہم لوگوں کو اگر منظور ہو کہ اپنے تئیں اس گرداب جہالت اور مذلت سے باہر نکالیں تو اُس کی اور کوئی شکل نہیں بجز اس کے کہ خدا سے مدد چاہیں کہ وہ ہم کو توفیق تحصیل علوم معاش کی بخشے۔ کوئی صورت اس بات سے بہتر واسطے حصول علم کے نہیں ہے کہ جن کو علوم معاش میں تکمیل حاصل ہے اُن سے ان علوم کو حاصل کریں وہ لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں۔ مجھ کو ساڑھے تیرہ برس اتفاق قیام یورپ کا ہوا اور اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے میں نے دریافت کیا کہ علوم معاش میں اہل یورپ

آج کل تمام عالم پر سبقت لے گئے ہیں سوائے امریکہ کے کہ سلطنت امریکہ کی اگرچہ بہ نسبت اور سلطنتوں کے گویا کل کی ہے تب بھی اُن لوگوں نے جتنی ترقی اس زمانہ قلیل میں کی اور کرتے جاتے ہیں میرے نزدیک کسی اور نے کم کی ہوگی۔ ان سب لوگوں سے تحصیل علوم معاش کا سبق لینا چاہیئے یورپ میں پانچ سلطنتیں ہیں کہ وہ بجز امریکہ کے تمام عالم پر زبردست ہیں۔ انگلینڈ فرانس۔ اسٹریا۔ روس۔ پروس۔ ان سب سلطنتوں میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ترقی علوم معاش باعث ان کی بزرگی اور قوت کا ہوئی ہے۔ ان ملکوں کے لوگ دوسرے ملکوں میں ہزارہا تکلیفیں اٹھاکر اور اپنی جان جوکھوں کرکے گئے اور جان کی قیمت پر بھی اپنی قوم کے واسطے علوم معاش اور دور دراز ملکوں سے حاصل کر لائے۔ مرد تو ایک طرف عورتیں بعضی بعضی اپنا گھر بار عیش و آرام یار و دیار چھوڑ کر واسطے دریافت حالات دوسرے ملکوں کے اور استفادے اپنی قوم کے باہر نکل گئی ہیں اور اسی کوشش میں مر گئیں یا قتل ہوگئیں مگر اپنی قوم کی بہبودی سے منہ نہ موڑا۔ **بیت**

بعد از فنا بھی ہم نے چھوڑا نہ تیرا دامن
ہم خاک بھی ہوئے تو تیری ہی رہ گزر کے

ایسے لوگوں میں ایک مس کارپنٹر ہیں جو ولایت سے تکلیف اٹھاکر بصرف کثیر ہند میں آئیں اور رضاءً للہ جو کچھ واسطے تعلیم نسواں کے اُن کی سعی و کوشش سے ہو سکا کر گئیں۔ اہل ہند بہت کم ہیں جو حوصلہ اور استطاعت اس بات کی رکھتے ہوں کہ یورپ میں جاکر تحصیل علم معاش کریں اگر کوئی قصد بھی کرے تو ناواقفوں کے طعنے ولایت جانے پر اور انگریزی زبان سیکھنے پر اور صرف کثیر راہ کا یہ سبب اس کے پر کاٹ دیتے ہیں۔ اس لئے بہت لوگ اگرچہ طالب علوم معاش ہوں ان کا دل تھوڑا ہو جاتا ہے۔ ولایت میں گنتی کے لوگ میں نے دیکھے جن کو یہ نعمت نصیب ہوئی ہو۔ بعض لوگ ایسے ہوں گے کہ جنھوں نے وہاں تحصیل علوم معاش زبان انگریزی میں کی ہو مگر ایسے لوگ ہندوستانی کہ جو زبان انگریزی میں مہارت کامل رکھتے ہوں میں نے

ولایت میں دیکھے ہیں نامور انگریزی دانوں میں میرے مہربان منشی سید عبداللہ صاحب مدرس لندن یونیورسٹی ہیں جن کو انگریزی زبان میں ایسا دخل ہے کہ بدوں تیاری اور آمادگی کے کمال صحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ لندن میں انگریزی تقریر کر سکتے ہیں۔ اور تقریر بھی کس کے آگے۔ صاحبانِ عقل و فرہنگ اہلِ فرنگ کے آگے جو زیور علم و فضل سے آراستہ ہیں۔ اور تقریر بھی کیسی جو میزان فہم اور فراست میں موتیوں کے ساتھ تولنے کے قابل ہووے۔ یہ بزرگ تعلیم مدرسہ کالج بنارس سے پائی اور زبان انگریزی ہندوستان ہی میں حاصل کی تھی۔ سوائے ان کے اور بھی صاحبانِ علوم میں نے ہند میں دیکھے جو ولایت بھی نہیں گئے تھے۔ اور وہ بھی تعلیم یافتہ ہند کے تھے۔ اُن کو زبان انگریزی اور قانون دانی میں ماہر کامل پایا اگرچہ طریقہ تکمیل تعلیم علوم معاش کا جیسا کہ ولایت میں حاصل ہو سکتا ہے یہاں ناممکن اور جو لوازم تعلیم وہاں مہیا ہیں یہاں نہیں۔ جب بھی سرکار گورنمنٹ کی عنایت سے جو مدرسے اب ہند میں مقرر ہوئے ہیں اُن میں بھی انسان اپنی معاش کا علم یہاں کے لائق بخوبی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اس قدر علوم جو یہاں حاصل ہو سکتے ہیں کوئی حاصل کر لیوے تو اگر اس کا رتبہ تکمیل علوم کا حاصل نہ ہوگا تو وہ ناقص بھی نہ رہے گا اور اپنی معاش بخوبی ہند میں پیدا کرے گا۔ مگر غضب یہ ہے کہ جو طریقہ تعلیم کا ممالک ہند بلکہ اکثر بلاد ایشیا میں جاری ہے۔ اگرچہ اُس کا کم فائدہ ہونا بلکہ بے فائدہ ہونا ظاہر ہے تو بھی لوگوں کو اس سے گریز نہیں ہوتا ہے۔ وہی پرانی لکیریں پیٹے جاتے ہیں اور اُن میں کوئی تغیر و تبدل کر کے کام کی باتیں نہیں پڑھاتے جن سے ان کی عقل بڑھے فہم زیادہ اور فلاحیت نصیب ہو۔ اور بہت لوگ ایسے ہیں کہ ناواقفیت سے لڑکوں کو سرکاری مدرسوں میں نہیں بھیجتے کہ مبادا وہ مذہب عیسوی نہ قبول کر لیں یہ خوف بالکل بے اصل ہے ولایت میں اور ہند میں میں نے بہت اسکول گورنمنٹ کے دیکھے کسی پر یہ نہ پایا کہ تعلیم مذہب کی ہووے۔ ولایت میں علاوہ مذہب ملکہ معظمہ کے اور بہت مذاہب نصاریٰ کے ہیں اور مدرسے واسطے تعلیم رعایا کے گورنمنٹ نے مقرر کیے۔ اُن میں لڑکے

ہر مذہب کے تعلیم پاتے ہیں اور تعلیم فرود یاست کے لوجہ شاش کی ان کو ہوتی ہے مگر مذہب سے کوئی سوال
نہیں کرتا ہے نہ وہاں نہ یہاں گورنمنٹ کو یہ منظور رہتا ہے کہ کوئی اپنا مذہب چھوڑ کے ان کا یا اور کوئی
مذہب عیسائی اختیار کرے۔ پس یہ خیال خام ہے اور رعایا کی بد اصل نہیں بعض لوگ ناواقف
حقیقت حال سے اور اپنے ان تفوق سے جو سرکار پر ہیں کہتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ کو عیسائی کرنا
ہندیوں کا منظور نہیں تو یہ مدرسے کیوں مقرر کئے۔ اور کیوں متحمل ان کے صرف کے ہوتے
ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ انگلینڈ اور ویلز میں بھی چودہ ہزار چھ سو مدرسے ہیں
جن میں ۱۸۶۷ء میں تیرہ لاکھ اکانوے ہزار ایک سو لڑکوں کی اوسط حاضری تھی۔ وہاں تو
سوائے چند لوگوں کے سب عیسائی ہیں پس وہاں بصرف کثیر جو یہاں سے بہت زیادہ ہے
کیوں ایسے مدرسوں کو جاری کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر بادشاہ پر ترقی اور پرداخت
اور فکر صلاح و فلاح رعایا کی واجب ہے۔ اس واسطے خراج ملک سے وہاں کے رہنے والوں
کے نفع کے واسطے کچھ روپیہ تعلیم میں صرف کیا جاتا ہے یعنی انھیں سے لے کر ان کی تعلیم میں
دیا جاتا ہے۔ اگر ہند میں بھی ایسا ہوا تو کیا یہ واسطے صلاح اور فلاح رعیت کے ہے **بیت**

براں باش تا ہر چہ نیت کنی
نظر در صلاح رعیت کنی

اگر ہم لوگوں کو اتنی لیاقت ہوتی اور گورنمنٹ سے درخواست کرتے تو جیسے اور ملکوں
میں آمدنی ممالک سے واسطے بہبود خلائق اور ترقی علوم معاش اور فنون کار آمدنی کے کروڑوں
روپیہ سالانہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر ہند میں بھی لاکھوں روپے صرف ہوتے تو کیا بعید تھا۔ مگر
ان سے شکایت کیا ہے۔ اگر ہے تو خود سے ہے۔ از ماست کہ بر ماست۔ جو لوگ کم مایہ علوم معاش
سے ناواقف ہیں وہ یہی نہیں کہ افلاس اور بے کاری سے مرتے ہوں بلکہ ذلت اور خواری
سے۔ اُن کا اور اُن کے ملک کا حال اور بھی تباہ ہے مگر جب بھی عنایت الٰہی سے بہت لوگ
ایسے ہیں کہ اس میں خوش ہیں **قصر**

پھٹے کپڑوں میں خنداں مثل گل ہیں
نہایت کیا بہار بے خزاں ہے

میں نے ولایت میں سُنا تھا اور ہند میں آکر بچشم خود دیکھا کہ بنگالی اور پارسی اور ہنود بہ نسبت مسلمانوں کے اپنے لڑکوں کو تعلیم علوم معاش کے واسطے مدارس سرکاری میں زیادہ بھیجتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر ہندو بنگالی اور پارسی عہدہ ہائے جلیلہ پر سرکار سے مامور ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ بہت نہیں مگر یہ گویا ہند کی ناک انگلینڈ میں ہیں اور ہندیوں کی استعداد لیاقت انگریزی دانی کی ان لوگوں سے وہاں ثابت ہوتی ہے۔ مجھ کو اپنے ہم مذہب بھائیوں کے حال پر کمال تاسف آتا ہے کہ وہ لڑکوں کو تعلیم انگریزی سے اور تحصیل علم معاش سے باز رکھتے ہیں اور برسوں ایسے کتب فارسی یا عربی پڑھاتے ہیں جن میں نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا۔ فارسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عبارت لکھنی آجاتی ہے اور عربی کا آخر تحصیل تک پڑھے تو کچھ دینیات سے واقف ہو جاوے مگر وہ لوگ جو تکمیل کر کے چھوڑیں سیکڑوں میں ایک دو ہوتے ہیں باقی سب درمیان راہ میں تھک کر بیٹھ رہتے ہیں اور جو لوگ آخر منزل تک پہونچے بھی تو اُن کے واسطے نوکریاں موافق اُن کے رتبہ کے کب ملتی ہیں۔ اور کسی کو ملیں تو شاذ و نادر ہیں۔ بعض لوگ تسکین اپنے دل کی فقط اتنی بات سے کر لیتے ہیں کہ ہم کو عقبیٰ حاصل ہو گئی دنیا نہ سہی۔ مگر عالم میں کتنے آدمی ہیں کہ جن کو یہ توکل اور رضا حاصل ہو کہ معاش سے مستغنی ہو کر راہ آخرت کی سنواریں غضب تو یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے تعلقات فرصت نہیں دیتے تا کہ راہ عقبیٰ کی درست کریں بلکہ دوبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام شعر

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ چونکہ معاد کا بدوں معاش حاصل ہونا اور قائم رہنا دشوار ہے اس واسطے تحصیل علوم معاش لابدی اور ضروری ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ ترقی علوم معاش باعث آرام و آسائش تن کا ہے اور خالق زمین و آسمان نے جسم تمہارا

جو پیدا کیا ہے تو اُس کو جان کی نعمت دے کر اور فہم و فراست کی قوت عطا کر کے نطق ظاہری و باطنی کے سبب سے اور سب حیوانات پر عزت و امتیاز بخشی ہے۔ پس ہم کو لازم ہے کہ مقصود اعلیٰ اور مطلب اصلی یہ نہ سمجھیں کہ اپنا شکم لقمۂ لذیذ سے بھر لیا اور بدن کو لباس عمدہ سے زیب و زینت بخشی ہے۔ یہی ہمارا کام تھا اور دنیا میں فقط تن پروری اور آسائش اور زیب و زینت بدنی کے واسطے پیدا ہوئے تھے رباعی

بہت لوگ ایسے کہ جن کا ہمیشہ　　مشیّن بدن تھا معطّر کفن تھا
جو قبر کہن ان کی کھودی تو دیکھا　　نہ تارِ کفن تھا نہ عضو بدن تھا

پھر آخر کچھ فکر مخلصی اس طائر روح کی کرنا چاہئے کہ اول جو اس قالب خاکی میں نہ تھا اور بعد اس میں آیا اور اگر مثل مرغ پربستہ دام ہوا و ہوس میں پڑ گیا اور پھر ایک روز اس قفس کو چھوڑ کر اُڑ جائے گا۔ پس جو کوئی جس مذہب میں ہو تلاش حق اور خوشنودی خالق اور جستجوئے راہِ راست اور اعمال صالحہ اور بندگانِ خدا کی نفع رسانی میں رہے اور خصائل حیوانی اور شہوات نفسانی سے خود کو دور رکھنے میں سعی و کوشش کرتا رہے اور جس مذہب کو اپنے ایمان سے حق حق سمجھے موافق اس دین و مذہب کے نیک کام اور اپنی عاقبت کا سرانجام کرتا رہے۔ اور ہمہ تن غلام دنیا اور بندۂ ہوا و ہوس نہ ہو جائے ورنہ آخر کو کف افسوس ملیگا اور اس وقت کہ جب افسوس فائدہ نہ کرے گا ؎

آگے کے دن پیچھے گئے لو ہر سے کیو نہ ہیت
اب پچتائے کا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اگر کوئی تمام کتب درسی جو بالفعل ہمارے یہاں مروج ہیں پڑھ جاوے اس سے منافع ان علوم کے جو آج کل ممالک یورپ میں تحقیق کو پہونچے اور فوائد ان کے مثل آفتاب نصف النہار کے روشن ہیں اور جن سے اکثر لوگ اس ملک کے اب تک بے خبر ہیں حاصل نہ ہوں گے۔ سچ تو یہ ہی کہ جو علوم تواریخ اور جغرافیہ زمین و آسمان و ریاضی و ہیئت و ہندسہ اور جر ثقیل اور

علوم حکمت وغیرہ کے جس طرح آج کل اہل یورپ کو حاصل ہیں اور جیسے وہ ان کو کر دکھاتے ہیں اور ان کے اعمال سے فائدے اٹھاتے ہیں اور خلائق کو فائدے پہونچاتے ہیں۔ ایسا کبھی نہ ہوا ہوگا اور اگر ہوا تو ہم لوگ اس کے حالات سے بے خبر ہیں کیونکہ علم تاریخ ہم کو اُن سے خبر نہیں دیتا بعض بعض جوابات سوالات مشکلہ کے علوم مذکورہ میں خورد سال بچے یورپ کے یوں دیں گے گویا ان کے ناخنوں میں لکھے ہیں۔ مگر عالمان سے دوسرے لکون کے ہرگز نہ دیئے یا دیں گے۔ نہ ان کی زبان پر نہ سینے میں نہ سفینے میں نکلیں گے۔ سبب اس کا یہ کہ وہ پرانی لکیر کو پیٹتے ہیں اور تحقیقات جدید کو نہیں دیکھتے اور بڑی آفت یہ ہوتی ہے کہ علی العموم جو شے ایک مہینہ میں حاصل ہو سکے اور آسانی سے حاصل ہو اس کو ایک برس میں اور کبھی یاد میں محنت سے حاصل کرتے ہیں اور اوقات عمر عزیز کے یوں ضائع ہوتے ہیں بعض لوگ بسبب تعصب کے یا بمقتضائے مذہب اور فتوے کے کیسے ہی فائدے کی چیز ہو اُس سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ یہ باتیں ایجاد اہل اسلام کی نہیں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے کرنے میں من تشبہ قوماً میں داخل ہوجاویں۔ اگر ہم لوگ ایسا ہی کریں کہ جو چیزیں ایجاد اور اختراع یہود اور نصاریٰ یا اور کسی فرقے اور دوسرے مذہب والے کی ہوں اُن کے استعمال سے پرہیز کریں تو نہ ریل گاڑی پر سوار ہوں نہ جہاز دودی پر سفر کریں۔ کل کا بنا ہوا کپڑا پہننا خلاف تقوے ہوگا۔ آلو کی ترکاری جو یہاں خاص انگریزوں کی لائی ہوئی ہے اس کو بھی کبھی نہ چھوئیں۔ جو لوگ ایسی ایسی باتوں میں تعصب کریں تو حوائج ضروری میں کتنا خلل ہوگا۔ اس طرح کے لوگ بڑے سدِ راہ تحصیل علوم کے ہیں۔ ان کے سبب سے نہ علوم معاش سیکھ سکتے ہیں کہ رفع مضرات دنیوی ہو نہ اس قدر اطمینان اور توکل اور رضا حاصل ہے کہ سب کو چھوڑ چھاڑ دیجئے اور دنیا و مافیہا سے تعلق بالکل قطع کر دیجئے اور خدا ہی کی طرف لو لگا کر بیٹھ رہیئے۔

مگر یہاں تو یہ حال ہے شعر

شب چو عقد نماز بر بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

ہیں سے نے ایسے لوگ بہت دیکھے کہ بھیجنا اپنے لڑکوں کا مدرسہ ہائے سرکاری میں گوارا
ہیں کرتے اور بھوکوں مرنا اور ننگے رہنا گوارا کرتے ہیں۔ ان کے واسطے بجز دعا کے اور
راکیا اختیار رہے۔ مگر بڑا افسوس ہاں روح یہ ہے کہ میں ہر روز اپنی آنکھ سے دیکھتا ہوں کہ اشراف
پنے لڑکوں کو تعلیم مدارس سے باز رکھتے ہیں اور اجلاف اپنے بچوں کو واسطے تعلیم کے بھیجتے
یں اگر ایسا ہی حال رہا تو جو کچھ ایک بڑے عالم اور مقرر نے ڈبلن میں مجھ سے کہا تھا وہی ہوگا
ینی اشراف چند عرصہ میں اس مقام پر ہوں گے جہاں اجلاف قبل اس کے تھے اور اجلاف جو
یں وہ پڑھ پڑھا کر اشراف ہو جاویں گے کیونکہ وہ علوم معاش میں ترقی کریں گے اور بسبب
محتاجی اور عدم قابلیت کے ان کے دستِ نگر ہوں گے۔ ایک بات سے دل کو تسکین ہے
جیسے اشراف کو اپنے لڑکوں کو مدرسوں کے بھیجنے میں تامل ہوتا ہے ویسے ہی بہت سے
جلاف ہیں کہ ان کو بھی تعلیم اور نماز کبھی راس نہیں آتی اور لڑکوں کو ممانعت کرتے ہیں۔
اگر یہ خوف ان لوگوں کو مدرسوں سے باز رکھے تو رکھے ورنہ شرفا کا خدا حافظ ہی ہے۔ بہت سے
کم ذات لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنے لڑکوں کو پڑھائیں لکھائیں گے تو پھر وہ نہ ہمارے
کام کے رہیں گے نہ وہ پیشہ کریں گے جو ان کے باپ دادا کرتے آئے ہیں اس خوف سے
پڑھاتے نہیں کئی روز ہوئے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی ایک تنبا کو والے کا قول اور اس کی
نصیحت تتلا تتلا کر کہہ رہی تھی واسطے سماعت سامعین کے عرض کرتا ہوں۔ سیدواڑے
محلہ شاہ آباد میں کہیں یہ عورت رہتی تھی کہنے لگی گھسو پوت کمر میں بہکتا لگایا تو کیا منشی کہائے
تو کیا گھوڑے پر چڑھے تو کیا دو خدمتگار آگے دوڑے تو کیا دو پیسے کا تھرالاؤ ٹاٹ بچھاؤ
باپ دادے کا نام چلاؤ۔ گاے تم کو چھنے تم گاے کو چھیو موسل تم کو چھنے تم موسل کو چھیو ا۔
کوتوال جانے فوجدار جانے کہ کیمو کا پوتا ہے۔ یہ بات آپ سب صاحبوں کو دل لگی اور
مضحکہ کی معلوم ہوگی مگر میرے نزدیک اسرار الٰہی میں سے ہے کہ ایسے ایسے خیالوں سے
وہ مدبّر کل ان لوگوں کو دبائے رکھتا ہے ورنہ بیچارے اشرافوں کا ٹھکانا کہاں ہو مگر یہ لوگ

ایسے ہوے اور بوڈے سے بہت دنوں تک نہیں ڈریں گے اور علم راس آئے یا نہ آئے باپ دادے کا نام رہے یا جائے گھسو پوت کو جہاں مزہ علم کا پڑگیا تو پھر وہ تنہا کو نہ کوٹیں گے شرفا کو سوائے اس کے اور چارہ نہیں کہ ان لوگوں سے جو اُن سے نیچے ہیں علم اور ہنر میں بالا رہیں اور اُن کو ایسا بلند نہ ہونے دیں کہ خود پست ہو جاویں سوائے اس کے کوئی صورت بچاؤ کی نہیں ہے کہ ایک بات شرفا کی البتہ حق بجانب ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو اگر گورنمنٹ کے مدرسوں میں بھیجیں تو صحبت ان کی اطفال کم ذات سے رہے گی اور اُن کی خو بو کہیں ان میں اثر نہ کر جاوے۔ ہاں ولایت میں بھی شرفا کو یہی تامل ہے اور جن کو مقدرت ہے اپنے لڑکوں کو ایسے گورنمنٹ اسکولوں میں نہیں بھیجتے مگر وہاں اور ہزاروں اسکول ہیں جہاں تعلیم لڑکوں کی بہت ہی خوب ہوتی ہے اگر یہاں آپ چاہیں اور اس وقت ہزار روپیہ مہینہ دیجیے تو اس نواح میں کوئی آپ کو نہ ملے گا جو ویسی تعلیم دے پھر کیا کیا جاوے۔ یا تو ویسی ہی تعلیم جو مدرسوں میں ہوتی ہے خارج سے بہم پہونچائیے یا لڑکوں کا وہاں جانا گوارا کیجیے۔ کیونکہ اگر خیال اور خوف صحبت اجلاف کا رہا تو وہ علم سے محروم رہے۔ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ جو گل کا طالب ہے وہ خار سے نہ ڈرے گا اور اگر گوہر آب دار کیچڑ میں بھی پڑا ہو تو جوہری اس کو اٹھائے گا اگر بدوں بھیجے مدارس کے لڑکوں کی تعلیم ممکن ہو تو کیجئے ورنہ

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یہ کروگے تو کیا کروگے

الم جو یہ ہے تو درد مندو کہاں تلک تم دوا کروگے

مگر میرے نزدیک حسن تدبیر ماسٹروں کی اور خوبی انتظام سے ہیڈ ماسٹروں کی شرفا کے لڑکے رنگ و بو اجلاف کے لڑکوں کی کبھی نہ پکڑ سکیں گے۔ اگر کسی کو زیادہ احتیاط ہو تو اپنا آدمی لڑکوں کے ساتھ کر دیا کرے کہ ان کو پہونچا آوے اور چھٹی کے وقت پھرے آیا کرے جیسا کہ کننگ کالج لکھنؤ میں بعض شرفا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ حفاظت تو نہیں ہو سکتی اور امید ہے کہ طلبا اپنے علم کے غرور پر متکبر ہو کر لوگوں کو حقیر نہ سمجھیں گے اور خود کو بالکل مثل صاحبانِ ولایت

انگلستان کے بات چیت لباس اور عادات و اطوار میں نہ بنائیں گے کہ یہ امر انگریزوں اور
ہندیوں دونوں کو برا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال تعلیم علوم معاش سے ہرگز بچوں کو باز نہ رکھنا
چاہیئے۔ اس باب میں اگر دفتر کے دفتر سیاہ کروں تو بجا ہے مگر نہ آپ کو سننے کی فرصت نہ
مجھ کو کہنے کی مہلت۔ **شعر**

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

میں زیادہ امرار در باب تحصیل علوم اس واسطے کرتا ہوں کہ مدت سے مجھ کو فکر تھی کہ ایسی
کون سی شے ہے جو بیچارے اہل ہند کو جو آج کل نہایت ہی فلاکت زدہ فقیر اور حقیر ہو گئے ہیں اس
آفت سے نکالے۔ بعد خوض اور غور کے مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ ہند جب تک گرداب جہالت سے باہر
نہ نکلے گا یوں ہی ڈوبا رہے گا اور سوائے اس کے کہ قوت علمی اور عقل معاش مدد کرے یہ ہاتھی
اس گہری کیچڑ سے نہ نکل سکے گا میری دعا ہے کہ خداوند عالم قلوب اہل ہند کو علم کی طرف رجوع
کرے اور علوم معاش سے ان کو اطمینان بخش کر توفیق بہبودی معاد کی دے۔ فائدے تحصیل علوم
کے اور مضرات عدم تحصیل کے آپ سب صاحبان پر ظاہر و آشکار ہیں۔ ترقی علوم سے ترقی
ہنروں کی ہوتی ہے۔ یعنی جب کوئی عالم ایک چیز ایجاد کرے گا تب ہنرمند اُس کو بنا کر اپنا ہنر
دکھائے گا اور جب علم و ہنر کی ترقی ہوئی تو ساتھ ہی اس کی دولت کی ترقی بھی ہوگی۔ اگر لوگ
اس ملک کے قابل اس کے ہوں کہ مثل حکام ولایت کے انتظام اور بندوبست کر سکیں تو سرکار
انگریزی ایسی بے انصاف نہیں کہ تمھارا حق چھین کر اوروں کو دے۔ وہ کروروں روپیہ جو
خراج ہند کا تنخواہ اہل ولایت میں جاتا ہے اور صاحبان سیف قلم اس سے پرورش ہوتے
ہیں وہ خود تمھارے ملک میں صرف ہوگا اور ولایت میں نہ جاوے گا تم کو ملے گا مگر لیاقت علمی
دکھانا اور خود کو علم اور فضل میں اُن کے برابر کرنا کہ جواب اس روپیہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں شرط
ہے اگرچہ سرکار انگریزی نے بڑی بڑی خدمتیں اہل یورپ کو دی ہیں اور ان سے چھوٹی خدمتیں

اہل ہند کے واسطے چھوڑ دی ہیں مگران عہدوں میں بھی جو دیکھا کہ کوئی عہدہ چار یا پانچ سو روپیہ مہینہ سے زیادہ کا ہے تو اُس میں بھی انگریز شریک ہیں اس کا سبب یہ کہ ہندوستان میں اس لیاقت کے کم نکلتے ہیں اور اگر اپنی قابلیت اور لیاقت ان عہدوں کی دکھاتے تو اجنبی اُن کے منھ سے لقمہ کاہے کو چھین لے جاتے مگر اتنا ہے کہ ولایت آج کل معدن علوم ہے اور جو تعلیم یافتہ وہاں سے آتے ہیں وہ امیدواران اہل ہند پر سبقت لے جاتے ہیں اور علوم معاش کی تعلیم ان کو ایسی ہوتی ہے کہ بہت کم ننگے بھوکے رہتے ہیں اور جو رہتے ہیں وہ فضول خرچی سے۔ جس کسی کو علوم معاش کا تماشا اور ان کی رونق اور فوائد بچشم دیکھنا منظور رہو اس کو ایک بار سیر ملک یورپ کی کرنا چاہیئے اور تکمیل تحصیل اُن علوم کی سوائے وہاں کے آج کل نہیں ہو سکتی اگرچہ یہاں بھی تحصیل ان علوم کی ممکن ہے مگر میں تکمیل کو کہتا ہوں۔ ولایت ان دنوں ایک بحر ذخار علوم کا ہے جس کی چھوٹی چھوٹی نہریں ان ملکوں میں پہونچ گئی ہیں اور کنارے ہی اُن جواہر آبدار کی جن میں کے بہت کم قیمت اور چھوٹے موتی ہم تک آئے ہیں۔ جلو ترقی علوم معاش کے ہر طرف آشکار ہیں کیسی کیسی کلیں داناؤں نے نکالیں اور صناعوں نے بنائی ہیں کہ ہزاروں آدمیوں اور جانوروں کا کام ایک کل آج دے سکتی ہی اور جو کچھ وہ مہینوں میں نہ کر سکتے وہ یہ دنوں میں کرتی ہی۔ چھاپے کو دیکھو کہ ترقی علوم کی اس سے کیسی کی ہی۔ ریل گاڑی اور جہاز دخانی کو ملاحظہ کرو کہ برسوں کا راستہ ہفتوں میں طے کرتے ہیں۔ جب برس دن کا سفر ایک مہینہ میں کر لیا تو جو ایک سال میں گیارہ مہینے بچے وہ قبل ایجاد ریل گاڑی اور جہاز دودی کے راہ میں صرف ہوتے اب وہ بچ رہے پس گیارہ مہینے انسان کی عمر میں بڑھ گئے۔ جہاں برسوں میں بھی خبر نجا سکتی۔ اب لحظوں میں پہونچتی ہی تار برقی دریائے شور میں پڑے ہیں۔ ہندوستان سے انگلستان تک اور انگلستان سے امریکہ تک خبروں کا تار لگا ہے۔ آلات حرب و ضرب کو دیکھئے تو ویسے ہی ہیں کہ ایک منٹ میں انسان پندرہ بیس ضرب بندوق کی لگا سکتا ہے اور تین چار کوس سے جہازی توپیں آگ برسا سکتی ہیں۔

یہ سب شگوفے ترقی علم معاش کے ہیں۔ اسی علم کی ترقی سے نئی دنیائیں نکالیں اسی کی ترقی سے ترقی تجارت ایسی ہوئی کہ انگلینڈ کا ملک تجارت اور دولت میں محسود عالم ہوگیا بہت سے تاجر اور دوکان دار کروڑپتی نکلیں گے اور بہت ایسے کہ خیرات میں لاکھوں روپئے دیدئیے یہ علم ہی کی قوت ہے جس سے ہند کا گوہر بے بہا تاج انگلستان میں لگا علم ہی سے پھریرا علم انگریزی کا پانہ دانگ عالم میں لہرا رہا ہے نہ فقط زمین کا حال علم سے اہل یورپ نے تحقیق کو پہونچایا بلکہ افلاک اور کواکب ثوابت وسیارا اور اٹھارہ ماہتاب نمودار اور کروڑ آفتابوں کی حقیقت دریافت کی۔ پیمائش اجرام علوی کی اور ان کا فاصلہ ایک دوسرے سے ان کی مقدار زمان اور مکان ان کے طلوع اور غروب کا ایسا دریافت کیا اور قاعدہ بندکرکے دکھایا کہ جس کو جس وقت چاہو آسمان پر ڈھونڈھ لو ایک دقیقے کا فرق ہو اس کی کیا مجال اس کے اندر کا حال جو سطح پر تھا جہاں تک معلوم ہوسکا معلوم کیا۔ چاند میں پہاڑ صاف دکھائے مشتری کے گرد کے چار زحل سات برشل کے چھ قمر سب نظر آئے۔ دوربین سے یہ کام لیا خردبین سے یہ حاصل ہوا کہ ماہیت اشیائے صغیرہ کی جو آنکھ کو یوں نظر نہیں آتیں۔ اگرچہ قریب ہیں۔ دریافت کی کہ باریک بال بہت موٹی بلی کے برابر دکھایا۔ اور اس سے اُس کی ماہیت اور بخوبی دریافت کی ہر ریزہ اصغر سنگ سرخ کا ایک بہت بڑا لعل خوشاب نظر آئے۔ ہر ذرّہ ریگ بیاباں کا آفتاب بن جائے۔ اس آلہ سے ایسی ایسی قدرت نقاشی اور مصوری اُس صانع بیچوں کی ظاہر ہوتی ہے اور ایسی صنعتیں اور رنگ کہ کبھی چشم فلک نے بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ آدمی کا تو کیا ذکر ہے یہ سب رنگ تحصیل علوم کے ہیں کہ جن سے حقایق موجودات عالم علوی اور سفلی کے یوں دریافت ہوتے ہیں اور دیدۂ حق بیں میں وجود ان مصنوعات کا صانعِ مطلق کی قدرت کا تماشا دکھاتا ہے۔ چشم بینا اور دل جویا چاہیے۔ اب میں سب احباب کو پھر مکرر اپنی رائے دیتا ہوں کہ سب صاحب تا بمقدور اس باب میں کوشش کریں کہ ترقی علوم باعث بہبودی اس ملک کا ہو اور لڑکوں کو خدا بہ توفیق دے کہ معاش سے فراغت

حاصل کر کے اپنے قلوب کو معاد کی طرف رجوع کریں کیونکہ دنیا مزرعۂ آخرت ہے اور مجاز قنطرۃ الحقیقت تاکہ جس وقت یہ روح اس کالبد خاکی کو چھوڑے اپنے کئے ہوئے سے شرمسار نہ ہو۔ خدا سب کو توفیق خیر عنایت کرے اور جو کوئی جس مذہب اور جس ملت میں ہو اس کی رحمت سے محروم نہ رہے۔

میر اولاد علی مدرس اعلیٰ عربی، فارسی، ہندوستانی

یونیورسٹی ڈبلن

جو آج کل برخصت یک سالہ ہند کو آئے اور جنھوں نے حکام یونیورسٹی اور بڑے بڑے صاحبان عالی شان سے خطوط و اسناد نہایت عمدہ اپنی کارگزاری پر پائے ہیں۔

فقط

شاہ آباد میں چند مہینے قیام کرنے کے بعد سید صاحب نے لکھنؤ جانے کا ارادہ کیا اور چونکہ وہاں پہونچنے کی جلدی تھی اور اندیشہ تھا کہ ہردوئی میں کوئی دوست روکنے پر اصرار نہ کریں۔ اس لئے علی الصباح سب سامان چھکڑے پر لاد کر روانہ کر دیا۔ اور تاکید کر دی کہ اگر گھونہ (بالامو اسٹیشن) پہونچتے پہونچتے دوپہر ہو جائے تو وہیں ٹھہر جائے اس لئے کہ آج شام کو ہم قیام کریں گے۔ مگر جب ہردوئی میں پہونچے تو محمد احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اصرار کیا کہ محمد اکرام اللہ خاں[له] ڈپٹی کلکٹر سے ملنے کے بعد جائیے گا

[له] - نواب یار جنگ مولوی محمد اکرام اللہ خاں بہادر مولوی نقی یاور خاں صدر الصدور کاکوروی کے فرزند ۱۲۴۶ھ کو پیدا ہوئے۔ قابل مدبر متدین انصاف پسند تھے۔ غدر سے کچھ قبل رائے بریلی میں بعہدۂ تحصیلداری ملازم ہوئے۔ بعد ازاں اناؤ میں محکمہ بندوبست کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کئے گئے۔ جب وہاں کام ختم ہوا ضلع ہردوئی کو بھیجے گئے اور یہاں درجہ سوم سے درجہ دوم تک ترقی پائی تھی کہ نواب سر سالار جنگ اول نے بکمال قدردانی حیدرآباد میں بلوایا۔ صدر تعلقہ داری گلمنشنری گلبرگہ پر مامور ہوئے عرصہ تک تعینات رہے اور اس شہر کی ترقی میں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مولوی اکرام اللہ خاں صاحب موصوف سے ملاقات ہوتے ہوتے گیارہ بج گئے۔ اب سید صاحب نے روانگی کا ارادہ کیا تو ڈپٹی اکرام اللہ خاں ممدوح نے کسی طرح نہ مانا اور کہا کہ کھانا کھانے کے بعد تشریف لے جائیے گا کچھونہ تک ہمارے گھوڑے آپ کو پہنچا آئیں گے۔ مجبورًا قبول کرنا پڑا اور ایک بجے کے قریب اپنے بھائی مولوی سید علی صاحب کے ساتھ ہردوئی سے روانہ ہو کر شام کو کچھونہ پہونچے۔ دوسرے دن وہاں سے چلے تو سندیلہ میں پہونچے۔ یہاں چودھری حشمت علی صاحب تعلقہ دار کے مہمان ہوئے اور رات ہی کو صبح کے سفر کے لئے وہاں سے ملیح آباد تک ڈاک بٹھا دی گئی اور شب کو چودھری صاحب ممدوح نے نہایت تزک و احتشام سے دعوت کی اور اصرار کیا کہ لکھنؤ میں جا کے آپ قیصر باغ میں میرے مکان میں ٹھیریں۔ سید صاحب نے خوشی سے قبول کیا اور دوسرے دن لکھنو پہونچکر قیصر باغ میں مقیم ہوئے۔ یہاں قدیمی احباب اور یورپ کے حالات سننے والے شائقین کا آپ کے پاس مجمع رہا کرتا۔

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ ایسی کوشش بلیغ کی کہ گلبرگہ کے درو دیوار آج تک ان کو یاد کرتے ہیں۔ یہیں نواب یار جنگ بہادر کا خطاب اور دو ہزاری منصب پانصد سوار و علم کا اعزاز حاصل کیا۔ اور یہی حسن انتظام دیکھ کر خاص حیدر آباد میں رکنِ مجلس مالگزاری مقرر کئے گئے۔ روبکار مورخہ ۳ رمضان ۱۲۹۹ھ میں نواب بشیر الدولہ بہادر صدر المہام نے آپ کی کارگزاری و قابلیت کی تعریف کی۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے کئی لاکھ روپیہ کا آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ اسسٹنٹ رزیڈنٹ نے بھی آپ کی بیدار مغزی و دیانت کی داد دی۔ حیدر آباد سے وظیفہ پانے کے بعد گورنمنٹ نے ریاست رام پور میں بھیجا اور وہاں جوڈیشل ممبر کونسل ریجنسی مقرر ہوئے۔ دو سال چند ماہ کام کیا اور نہایت نیک نامی کے ساتھ گورنمنٹ سے پنشن پا کر وطن آئے۔ اور کئی سال آرام سے زندگی بسر کر کے ۱۲ ماہ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ روز دوشنبہ کو بعارضہ استسقا ۷۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کئی سال ہوئے احقر حضرۃ بندہ نواز خواجہ سید محمد گیسو دراز کے عرس میں گلبرگہ حاضر ہوا اور آپ کے ہم منصب مولوی عبدالقادر صاحب صوبہ دار دگلشنر کے پاس ٹھہرا تو دیکھا کہ ایوان صوبہ داری میں آپ کی تصویر بطور یادگار آویزاں ہے۔

راجہ شعبان علی خاں صاحب تعلقہ دار سلیم پور اور مرزا محمد عباس بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر کی سید صاحب سے دوستی اس قدر بڑھی کہ اکثر اوقات وہ ہر دو صاحب آپ کے پاس آکر بیٹھے رہتے بلکہ مرزا صاحب موصوف آپ کی دل چسپ باتوں میں ایسے مشغول ہوتے کہ بعض روز اجلاس کو بھی نہ جاتے اور صاحب ڈپٹی کمشنر کو علالت کا عذر لکھ کر بھیج دیتے۔ علمی مباحثے اور پر مغز مکالمے ہوا کرتے۔ اسی زمانہ قیام لکھنؤ میں سید صاحب نے انجمن تہذیب لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں ۱۴ مئی ۱۸۷۰ء روز یک شنبہ کو ایک بڑے مجمع کے سامنے جس میں ہزارہا ہندوستانیوں کے علاوہ یورپین کی بھی ایک کافی تعداد موجود تھی انگریزی طرز معاشرت پر ڈیڑھ دو گھنٹہ تک ایک لکچر دیا۔ جو چیز اس وقت لکھنو کی پبلک کے لئے بہت نئی اور عجیب تھی۔ یہ لکچر بہت بڑا اور قریب ستر صفحے کے ہے۔ کل عبارت کی نقل موجب طوالت ہے اس لئے اس کا اختصار یہاں پر لکھا جاتا ہے۔

۲۴ مئی ۱۸۷۰ء کے اودھ اخبار میں اس جلسہ کی پوری کارروائی چھپی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نواب فرخ مرزا بہادر پریسیڈنٹ جلسہ تہذیب میر مجلس تھے۔ ٹھیک ۶ بجے شام کو مجمع پورا ہو گیا تھا۔ جس میں انگریز، ہندوستانی، بنگالی خلوص و یک جہتی کے ساتھ ملے جلے بیٹھے تھے اور اُسی وقت سید صاحب تشریف لائے اور تقریر شروع کی۔

تمہید تقریر ثانی مسمّیٰ بہ آداب انگلستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ حامداً و مصلیاً۔ تمہید کے طور پر پہلے یہ فرمایا کہ قریب چودہ سال کے بعد انگلستان سے جب یہ عاجز اپنے وطن مالوف میں آیا تو یہ خیال ہوا کہ کوئی تحفہ اپنے ہم وطنوں کے واسطے نہ لایا۔ مگر افسوس کہ ولایت میں کوئی چیز اس قسم کی نہ تھی جو میرے جملہ ہم وطن احباب کو کفایت کرتی اس لئے میں دل میں منفعل تھا لیکن جب کوئی صاحب ملاقات کے لئے تشریف لاتے تو وہ لندن کے حالات سُن کر بہت خوش

ہوتے تھے۔ ان کی اس مسرّت سے میں اپنی شرمندگی بھول جاتا تھا۔ علاوہ بے تکلف دوستوں کے بہت سے اور لوگ ملنے آتے اور مجھ سے کہتے کہ لندن کے کچھ حالات سنائیے۔ چنانچہ حسب فرمائش دس بیس بلکہ تیس۳۰ چالیس مرتبہ سے زیادہ وہاں کے حالات بیان کرنا پڑے اب یہ حال ہوا کہ جو صاحب انگلستان کی کیفیت سُن کر گئے انھوں نے اپنے احباب کو مشتاق کیا وہ بھی تشریف لائے جس سے ایک تسلسل شروع ہوگیا او یہ بجز لندن کے حالات بیان کرنے کے اور کاموں میں خلل واقع ہوا۔ میں اگر ان کو راضی رکھوں تو تمام اشغال دینی و دنیوی سے دست بردار رہوں اور اگر ناراض کروں تو انسانیت کے خلاف۔ یا الٰہی اب کیا کیا جائے ؎

بیگانہ گشت خلقے تا یار آشنا شد
یارے نہ شد ستم شد الفت نہ شد بلا شد

آخر اس امر پر معزز احباب کی رائے قرار پائی کہ ایک تقریر وہاں کے عادات و اطوار و رسم پر عام جلسہ میں بیان کرکے چھپوا دی جائے کہ جو لوگ انگلستان کے حالات کے مشتاق ہوں وہ اس کو پڑھ لیں۔ اس پر سکرٹری صاحب جلسۂ تہذیب نے اصرار کیا کہ وہ لکچر ہماری انجمن میں دیا جائے۔ چنانچہ آج اس امر کی تعمیل کی گئی۔ آج کل اکثر اہل ہند کو حکام انگریزی سے کام رہا کرتا ہے اور بعض انگریز یہاں کے شرفا سے بسبب ناواقفیت راہ و رسم کے ملنے میں بے رخی کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں کے امرا سے جو طریقہ ملنے میں اختیار کرتے ہیں ولایت کے اجلاف سے بھی عمل میں نہیں لاتے۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے یہاں کے حکام سے کوئی شکایت ہے بلکہ مجھ سے صاحب چیف کمشنر اور فنانشل کمشنر اور ریونیو کمشنر ملاقات میں جس عنایت و عزت سے پیش آئے اور جن جن صاحبوں نے مجھے بلا کر اپنی اپنی مجالس میں شریک کیا ان کا میں نہایت مشکور ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ میرے ہم وطن اگر انگریزی عادات و اطوار سے آگاہ ہوجائیں گے تو اُن کو ملنے جلنے میں آسانی اور فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر میرے سامعین

عنایت آگیں کو احقر کے بیان سے ایک بات مفید معلوم ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری سعی مشکور اور میری محنت وصول ہوئی۔ اہل ہند کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے اور انگریزی عادات و آئین میں کس قدر فرق ہے اور یہاں کے اور ولایت کے مراسم میں کس قدر اختلاف ہے کونسی شے ان کو مرغوب اور کونسی بات وہاں معیوب ہے۔ اگر میں سالہا سال انگلستان کے مراسم و آئین پر گفتگو کروں جب بھی ختم نہ ہوں۔ اکثر رسوم سالانہ ماہوار بلکہ ہفتہ میں بدل جاتے ہیں۔ لہذا اگر میرے بیان میں کچھ کمی بیشی ہو جائے تو معاف فرمایئے گا۔ میں ساڑھے تیرہ برس انگلینڈ۔ آئرلینڈ۔ اسکاٹلینڈ۔ ویلز۔ فرانس میں رہا جو کچھ بچشم خود دیکھا ہے اُس میں سے تھوڑا سا انتخاب کر کے بیان کرتا ہوں۔

انگریز اکثر صبح کا لباس شام تک پہنے رہتے ہیں۔ مگر ان کی عورتیں کئی بار لباس تبدیل کرتی ہیں۔ وہاں دوپہر اور شام کا لباس علحدہ علحدہ ہوتا ہے دوپہر کے قریب یا بعد جب وہ لباس پہنتی ہیں تو صبح کے لباس سے بہتر ہوتا ہے کیوں کہ اس وقت ان کو دوسروں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ اکثر میمیں اپنی پوشاک پھول دار پنوں سے ٹاک لیتی ہیں جب اتارتی ہیں تو پنوں کو نکال لیتی ہیں۔ تہذیب و شائستگی کمال کے درجہ تک پہونچ گئی ہے۔ کوئی کسی سے ملنے کو جاتا ہے تو اُس کا نوکر دروازے پر آکر یہ نہیں پوچھتا کہ آپ کا کیا نام ہے۔ بلکہ کہتا ہے کہ میں آپ کی طرف سے جاکر کیا عرض کروں وہ شخص اپنے نام کا ٹکٹ دے دیتا ہے۔ نوکر جاکر اپنے مالک کو خبر کرتا ہے۔ اگر اُس کو ملاقات منظور رہے تو ملازم بیٹھنے کے کمرے میں لے جاکر بٹھلا دے گا اور مالک مکان جلد آئے گا اور اگر ذرا دیر ہو گئی تو فوراً معافی چاہے گا۔ عام دعوتوں میں نشست کا یہ طریقہ ہے کہ ایک ایک میم ایک ایک صاحب کا ہاتھ پکڑ کر میز پر جاکر کھانا کھاتی ہے اور نشست میں عورتیں داہنے طرف اور مرد بائیں جانب ہوتے ہیں۔ سب کے بیٹھ جانے کے بعد گھر کی بی بی کسی معزز انگریز کے ساتھ بیٹھتی ہے اور کھانا کھاتی ہے اور کھانا کھلانے میں ہر قسم کے ذکر اذکار ہوتے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جس طرح ذلیل و کمینے لوگ گالیاں

بکتے ہیں وہاں ایسا نہیں مگر جو انگریز یہاں آتے ہیں ان میں سے اکثر گالیاں سیکھ جاتے ہیں
جب کوئی ان کے مکان پر ملاقات کو جائے اہل ولایت کمال اخلاق سے پیش آتے ہیں
کہ انسان متحیر ہو جاتا ہی۔ کسی کے مکان پر جانے کے واسطے وسیلہ نہایت ضرور ہی۔ گفتگو ان لوگوں
کی ایسی نرم اور شائستہ ہوتی ہے کہ کوئی لفظ جس میں شائبہ کرختگی کا ہو زبان پر نہیں لاتے۔
شائستہ لوگوں کو چلّا کے بولنے کی بھی عادت نہیں۔ شرفا الفاظ مکروہ زبان پر نہیں لاتے اور
مین نے جیسے شائستہ اور با ادب فرانس کے آدمی دیکھے کہیں کے نہیں دیکھے۔ اور یہ
قوم ادب و شائستگی میں ضرب المثل ہی۔ انگلستان کے شرفا مغرور نہیں مگر عزت و آبرو کا پاس
زیادہ رہتا ہے۔ شرفا و معزز لوگ اپنے نوکروں کی بھی عزت کرتے ہیں۔ ملکہ معظمہ سے لے کر
غریب آدمی تک جب نوکر سے کسی کام کو کہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مہربانی کرکے یہ کام کر دو
کوئی چیز مانگتے ہیں تو بطور حکم نہیں مانگتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ یہ چیز تم ہم کو لا دو گے۔ یا اگر تمہاری
خوشی ہو تو یہ چیز ہم کو لا دو۔ وہ جواب میں کہتا ہی کہ جی صاحب اور وہ جب کام کر دیتا ہی
تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ولایت میں ہندوستان کی طرح سائیس کو گھوڑے کے ساتھ
نہیں دوڑاتے بلکہ اس کے لئے دوسرا گھوڑا موجود ہوتا ہے جس پر سوار ہو کر وہ ساتھ آتا ہی
اور صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ اس کا گھوڑا مالک کے گھوڑے سے ذرا پیچھے رہتا ہی
اور لباس میں بھی فرق رہتا ہے۔ اگر کسی نوکر کو کوئی آقا بدمزاجی سے زبان درازی کرے
یا مارے پیٹے تو اُس مالک کو بشرط ثبوت عدالت سے سزا مل سکتی ہی۔ اور ملازموں کی یہاں تک
خاطر داری کی جاتی ہے کہ بعض تقریبات میں ملکہ معظمہ اور ان کے شوہر پرنس کانسارٹ نے
جن کی موت کا داغ ابھی تازہ ہے اپنے نوکروں کے یہاں جا کر زنان خدام کے ساتھ دست
بدوش رقص کیا ہی۔ ان شاہانہ نوازشوں سے نوکروں کی عزت بڑھ گئی اور ملکہ وکٹوریہ کی
بادشاہی اور شان و شوکت میں کچھ کمی نہ ہوئی۔ جو اپنے نوکروں کو ذلیل رکھتا ہی وہ اپنے
افسر اور حاکم سے بھی ذلیل رہتا ہے ؎

خود بھی ذلیل عاشقِ غمخوار بھی ذلیل

گل بھی ذلیل بلبل گلزار بھی ذلیل

بہت لوگ ہر روز صبح کے وقت غسل یا حمام کرتے ہیں جاڑا ہو یا گرمی جو لوگ سارا بدن نہیں دھو سکتے وہ اوپر کا آدھا بدن دھوتے ہیں۔ اور بدن جب خشک ہو گیا تو صبح کا لباس پہنتے ہیں اور کھانا کھانے کے کمرے میں یا بیٹھنے کے کمرے میں آکر روزانہ اخبار ضرور پڑھتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے کون پیدا ہوا اور کس کی شادی ہوئی اور کون مرا۔ اگر اُس وقت فرصت نہ ہوئی تو دوسرے وقت پڑھ لینگے۔ اور جب تک میز پر حاضری آئے اخبار بینی کا شغل جاری رہتا ہے۔

ولایت میں نان پاؤ ہوتا ہے مگر یہ ڈبل روٹی بھی کم کھائی جاتی ہے زیادہ تر گوشت و ترکاری پر بسر ہوتی ہے اور جن کو گوشت نصیب نہیں ہوتا وہ فقط ترکاری پر قناعت کرتے ہیں۔ ہندوستان کا سا عمدہ کھانا وہاں نہیں۔ قورمہ پلاؤ وغیرہ وہاں کسی کو کم پکانا آتا ہے۔ مٹھائیاں بھی جیسی یہاں ہیں وہاں نہیں ملتیں اس میں لوگوں نے کم ترقی کی ہے۔ بہ نسبت انگلینڈ کے فرانس کے باورچی زیادہ سلیقہ شعار ہوتے ہیں اور اکثر اہل دول انگریز فرانس کے باورچی اور باورچنیں ڈھونڈ کر نوکر رکھتے ہیں۔ میرے ایک دوست کرنل میڈوز ٹیلر ڈبلن میں ہیں ان کو بدون ہندوستانی کھانے کے چین نہیں آتا۔ اس واسطے ایک شخص شیخ امیر نامی باورچی جو ڈبلن میں ہے اس کو بلوا کر اُس سے ہندوستانی کھانا پکوا کر کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی اور لارڈ اور امرا بھی اب ہندوستانی کھانے وہاں بہت کھاتے ہیں۔ جو انگریز ہندوستان میں رہ جاتے ہیں اُن کو اکثر ہندوستانی کھانے سے رغبت ہو جاتی ہے اور زیادہ مرغن کھانے اُن ملکوں میں مضرت بھی پیدا کرتے ہیں۔ ولایت میں بعد نمکین کھانوں کے میٹھے کھانے اور پھر میوے خشک و تر کھانے کا معمول ہے۔ چھری کانٹے سے کھانا نہ صرف اہل انگلستان کا دستور ہے بلکہ اب ترک و عرب میں بھی رواج ہو گیا ہے۔ بعد کھانے کے چاء کا دورہ ہوتا ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس پلیٹیں

ایک ایک آدمی کے سامنے بدلی جاتی ہیں یعنی کھانے کے اتنے اقسام باری باری سے آتے ہیں لیکن ہر شخص کے آگے کھانا اتنا ہی رکھا جاتا ہے کہ جتنا وہ کھا سکے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک تورے کا تورا ہر شخص کے سامنے رکھ دیں جیسا کہ امرائے ہند کے یہاں شادیوں وغیرہ میں دستور ہے۔

پھر فرمایا کہ وہاں سلام کرنے کے کئی طریقے ہیں مرد کو سلام اور طرح سے کرتے ہیں اور عورتوں کو دوسری طرح سے۔ عورتیں جس ناز و انداز سے صاحب سلامت کرتی ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مرد جس سے ربط ضبط ہو یک دستی مصافحہ کرتے ہیں اور اگر اجنبی ہو تو اُس کے آگے خمیدہ ہو کر پھر سیدھے ہو جاتے ہیں۔ اور لیڈیاں بھی یا تو مصافحہ کرتی ہیں یا پہلے ایک ادا سے جھک کر پھر سروقد سیدھی ہو جاتی ہیں۔ مرد کی جب پہلی مرتبہ میم سے ملاقات کرائی جاتی ہے تو وہ اکثر سینہ پر ہاتھ رکھ کر مثل کمان کے خم ہو جاتا ہے۔ اور لیڈی جیسے کہ گل کی شاخ گلوں کے بار سے لچک جاتی ہو جھک جاتی ہے۔ مرد جو جھکتے ہیں وہ ایک لکڑی کی طرح۔ مگر عورتیں جو جھکتی ہیں وہ نہایت حُسن و ادا سے اثنائے راہ میں جب انگریز کسی میم کو سلام کرتا ہے تو اپنی ٹوپی داہنے ہاتھ سے اُتار لینا یا سر پر سے اُٹھا لیتا ہے۔ یہ سلام گویا بڑی تعظیم کا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے قریب آ گیا اور گفتگو کرنا منظور ہوا تو یوں باتیں شروع کرتے ہیں کہ آج اچھا دن ہے یا بُرا بڑی گرمی ہے یا بہت سردی اس کے بعد جو مدعا ہو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک صاحب کا تذکرہ بیان کیا کہ وہ ولایت سے اردو پڑھ کر ہندوستان میں آئے اور اپنے نزدیک اردو خوب جانتے تھے۔ مگر زبان دانی کا یہ حال تھا کہ سائیس سے بجائے گھوڑا ٹہلاؤ کے گو راتلوا اور خدمتگار سے پیالے دھو کر لاؤ کے بدلے دو کر لاؤ اور گاڑی کو سائے میں رکھو کے بجائے گاڑی کو فانوس میں رکھو ایک دن کا ذکر ہے کہ کسی ضرورت سے کوئی زمیندار ان کے پاس آیا اور ان کو کسی کام کے واسطے جانا تھا۔ تھوڑی دیر اس سے باتیں کر کے چاہتے تھے کہ رخصت ہوں اپنے انگریزی قاعدہ کے موافق بجائے گڈ مارننگ کے اس کا ترجمہ اردو زبان میں اُس سے

کہا کہ ویل ٹھاکر اچھا صبح ہی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا ہاں خداوند بہت اچھا صبح پھر صاحب نے کہا کہ اچھا صبح ہے اُس نے بھی وہی کہا کہ اچھا صبح اسی طرح تین چار دفعہ نہایت خفا ہو کر اور جھینک کر اچھا صبح اچھا صبح کہتے ہوئے چلے گئے وہ بیچارہ نہایت پریشان ہوا کہ ابھی صاحب تو اچھے خاصے تھے یہ دم بھر میں ان کو کیا ہو گیا۔ پھر جب ادھر ادھر لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ صاحب سلام کر کے رخصت ہونا چاہتے تھے۔ یہ اُن لوگوں کا حال ہی کہ جو ارد ولڑھ کر آتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ بلا ارد و پڑھے ولایت سے ہند کو آئیں تو کیا کیا ظلم ان کی ناقہمی سے رعایا پر نہ ہوں گے۔ ایک بار میں ایک مخلص دوست کے مکان پر شب میں ٹھہرا۔ جب رخصت ہو کر خواب گاہ کو جانے لگا تو انھوں نے اور گھر کی بی بیوں نے جس وقت رخصت کا مجھ سے مصافحہ کیا تو کہا گڈ نایٹ اولاد علی یعنی رات کی خیر۔ جس سے زیادہ ارتباط و محبت ہو شب کو رخصت کے وقت اس کا نام گڈ نایٹ کے بعد لیتے ہیں ورنہ لفظ مسٹر عوام کے نام کے پہلے لگاتے ہیں۔ یہ طریقے صاحب سلامت کے میں نے بیان کئے ہیں درباری طریقے اس کے بعد عرض کروں گا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ پرنس آف ویلز ولی عہد انگلستان یعنی (ایڈورڈ ہفتم) اور ڈیوک آف کیمبرج یعنی ملکہ معظمہ کے ماموں اور وزیر اعظم اور فوج کے تمام اعلیٰ حاکم جب ٹرنٹی کالج ڈبلن میں بنا برایڈمنڈ برک یعنی اژدہاتی پتلے سے غلاف اُتارنے کے لئے انگلستان سے آئے کیونکہ جس شخص کا یہ اسٹیچو تھا وہ پارلیمنٹ میں بڑا مقرر اور ہندستان کا بہت خیر خواہ تھا تو میں نے قریب جا کر ہندوستانی طرز سے سلام کیا۔ پہلے پرنس کو پھر ڈیوک کو بعدہ ویسرائے گورنر جنرل کو تینوں صاحبوں نے میرے سلام کے جواب میں اپنی اپنی ٹوپیاں سر سے اتار لیں مگر ملکہ انگلستان کی بہو پرنس آف ویلز کی بی بی (ملکہ الگزنڈرا) نے حسب معمول ایک ادا سے مسکرا کر سر کو جھکایا جو ایسے ذی رتبہ ہیں ان کا جوابی سلام اسی طور پہ ہوتا ہے۔ سچ ہی۔ نہد شاخ پر میوہ سر برزمین۔ گورنر جنرل لارڈ لفٹنٹ آف آئرلینڈ کے دربار میں بجز طریقہ سلام کا دیکھا وہ جدا تھا۔ جن شخصوں سے ویسرائے کی ملاقات تھی اُن سے ہاتھ

ملایا اور جو شخص درباری تھے وہ نمبروار سامنے آئے اور ادب سے قد جھکا کر چلے گئے وائسرائے بھی جھکتے رہے۔ درباری لباس بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مجھ کو حکام مدرسہ نے مدرسہ کے خاص لباس کے پہننے سے مستثنیٰ کردیا ہی مگر میں دربار میں اپنے ہندوستانی لباس سے جاتا ہوں سر سے پا تک وہ بھی سب چیزیں ہندی اور سلام بھی اپنے ہی طور پر کرتا تھا۔ ارل آف ڈلالیل وائسرائے ملکہ معظمہ دربار میں مجھ سے ہاتھ بھی ملاتے ہیں یہ عزت سب کو نہیں حاصل ہی۔ پہلے روز جب انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو خود وائسرائے گورنر جنرل نے فرمایا کہ مدرسہ کے افسر اعلیٰ کے مکان پر ایک تقریب میں ہم گئے تھے اُس نے آپ کو ہم سے ملایا تھا۔ ایک مرتبہ عین دربار میں اُنھیں وائسرائے نے مجھ سے پوچھا کہ تمھارے نزدیک ہمارے ملک کی عورتوں کا حسن کیسا ہی تم کو پسند ہی یا نہیں۔ میں نے کہا کہ بلا کا حُسن ہی اور مجھے بہت پسند ہی یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ جو لیڈی پہلی بار دربار میں جاتی ہی اُس کے رخسارے پر وائسرائے بوسہ دیتے ہیں گویا وہ رعایا کے بجائے باپ کے ہیں اور وہ اُن کی مثل بیٹیوں کے ہیں ملکہ معظمہ جب یورپ کے بادشاہوں سے ملتی ہیں تو اُن سلاطین کا دستور ہی کہ ان کے رخسارے پر بوسہ دیتے ہیں گویا آپس میں بھائی بہن ہیں ۱۸۶۹ء میں سلطان المعظم قسطنطنیہ سے جب لندن آئے تو انھوں نے جناب ملکہ معظمہ کا فقط ہاتھ چوما تھا اور ملکہ ممدوحہ نے سلطان روم کے شاہزادہ کا مُنہ چوما تھا۔

ان سرد ملکوں میں رقص ایک ریاضت سمجھا جاتا ہی اور ریاضت بھی ایسی جس میں ان کو ہزاروں طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہی مگر بعض ثقہ جو نہایت پارسا و متشرع ہیں نہ ان کو راگ کا لطف ہی نہ رقص سے رغبت گانے بجانے کو معیوب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ رقص ان کے نزدیک رقص وغیرہ بے فائدہ بلکہ بعضوں کے نزدیک گناہ ہی۔ مگر جن لوگوں کو اس کا مزہ ہی اُن کے نزدیک اس سے انکار بدتر از گناہ ہی جس مجلس میں رقص کے لئے مہمان مدعو ہوتے ہیں اس میں ایک کمرہ خاص لباس بدلنے کے لئے خاص کردیا جاتا ہی اور دوسرے کمرے میں

چاء قہوہ ماکولات مشروبات جن میں ہر قسم کی مٹھائیاں گوشت پکوان جھلیاں وغیرہ موجود ہوتی
ہیں۔ جو چیز جس کو مرغوب ہو فوراً خدمتگار حاضر کرتے ہیں۔ میزوں کی آراستگی خوش نما
پھولوں کے گلدستوں سونے چاندی کے برتنوں اور شیشہ آلات سے قابل دید ہوتی ہے
پادری علی العموم ناچ کی صحبتوں میں نہیں جاتے۔ ولیسرائے جب ان کو کھانے کی دعوت میں
بلاتے ہیں تو بعد کھانے کے رخصت کر دیتے ہیں۔ بعض باپ جو متقی ہوتے ہیں ان کے بیٹوں
کو ایسی مجلس میں زیادہ بیٹھنا ناگوار ہوتا ہے۔ ناکتخدا لڑکیوں کو گانے اور ناچنے کا بہت شوق
ہوتا ہے۔ نو خیز لڑکیوں کا یہ عالم ہے کہ ناچ گانے کے شوق میں تین تین چار چار دن تک سوتی
نہیں۔ ایک ہی عورت کے ساتھ کوئی شخص کئی بار ناچے تو انگشت نما ہو جاتا ہے۔ چاہیے کہ اپنی
رفیقۂ رقص کو بدلتا رہے۔ میں نے صرف تین چار ہی لڑکیاں ایسی دیکھیں کہ جن کو رقص وغیرہ
سے نفرت ہے باقی بڑے بڑے پادریوں کی بیٹیوں کو بھی راگ و رقص کا شایق پایا۔ ان
لڑکیوں میں جن کو رقص سے نفرت ہے ایک میری شاگرد ہیں۔ دوسری ہیں وہ مسز بیروٹ میں
اکثر رہتی ہیں۔ تیسری اُردو میں جو ہندو آنے والی ہے۔ چوتھی ایک فرانس کی کونٹس کی
بیٹی ہیں۔ انھوں نے تمام زبانیں مشہور یورپ کی تحصیل کر کے فارسی کا شوق کیا اور مدت تک
مجھ سے فارسی پڑھی۔ ان کی ماں لیاقت و وضع داری اور قابلیت و دین داری میں ایسی
یکتائے روزگار عورت ہیں کہ جن کی نظیر مردوں میں بھی کم نکلے گی۔ بعد دربار کے ویسرائے
کے یہاں جو دعوت ہوتی ہے اُس میں اکثر معزز انگریز و لیڈیز شریک ہوتی ہیں۔ ایک دالان میں
ویسرائے اور اُن کے عزیز و اقارب اور دوسرے دالانوں میں دیگر مرد و عورتیں رقص کرتی
ہیں۔ شام کا لباس عورتوں کا خوبصورت ہوتا ہے مگر مردوں کا خوش قطع نہیں ہوتا۔ شام کے
لباس میں سر پر پھول یا مرصع شانہ یا طلائی تاج نما حلقہ یا کوئی اور شے آرائش کی لگاتی ہیں۔
ٹوپی نہیں پہنتی۔ جواہرات بھی استعمال کرتی ہیں۔ ولایتی زیور بعضے ہندوستانی زیوروں کے
مشابہ ہوتے ہیں مگر نتھ چوڑیاں بالیاں پتے جوشن بازوبند وہاں کوئی نہیں پہنتا بلکہ نتھ کے

ذکر پر قہقہہ مار کر لوگ ہنستے ہیں۔ کان کی لو میں فقط زیور پہنتی ہیں۔ بعض میمیں سابق میں گلگونہ لگاتی تھیں جس سے رخسارے اور بھی گلرنگ معلوم ہوتے تھے۔ حسب حیثیت جواہرات و پوشاک ہوتی ہے۔ اُن کے زیور اگرچہ سادے اور سبک ہوتے ہیں اور مثل ہندوستانی زیورات کے بھاری نہیں ہوتے مگر نہایت قیمتی خوبصورت بناتے ہیں۔ خوش پوشاکی و جامہ زیبی میں اہل فرانس ضرب المثل ہیں۔ ایک صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ فرانس کی عورت کو اگر ایک پرانی چادر بھی دو تو وہ اس خوبصورتی سے اوڑھے گی کہ بھلی معلوم ہو۔ اہلِ انگلستان لباس و آرائش میں فرانس کی پیروی کرتے ہیں جو جدید قطع اور طرز نو لباس و زیور میں وہاں جاری ہوئی فوراً انگلستان میں پھیل گئی۔ درزیوں کے وکیل فرانس میں موجود رہتے ہیں۔ جہاں کوئی نئی چیز وہاں ایجاد ہوئی کہ فوراً اس کی تصویر یا اصلی شے انگلینڈ اور دیگر ملکوں میں پہونچ گئی ولایت میں چھوٹے ہاتھ پاؤں خوبصورتی کی دلیل سمجھے جاتے ہیں۔ بعض لوگ بوٹ اور دستانے میں بڑی دولت صرف کرتے ہیں کہ چھوٹے نظر آئیں جو انگریز و میمیں ہندوستان سے واپس گئے ان کی زبانی سنا ہے کہ جیسے سڈول ہاتھ پاؤں اور موزوں بدن ہندوستان میں دیکھے اور ملکوں میں کم دیکھے۔ بلکہ ایک انگریزی کتاب میں ضرب المثل لکھا ہے کہ ہاتھ ہندوستان کیسے۔ ولایت میں میں نے ایک میم کے ہاتھ ایسے چھوٹے اور خوش اسلوب دیکھے کہ کہیں دیکھنے میں نہ آئے۔ میرا ہاتھ اگرچہ مصافحہ میں پیش دستی کرتا تھا مگر اُن کی انگلیاں میرے ہاتھ تک نہ پہونچتی تھیں۔ میں نے ایک روز کہہ دیا کہ آپ مجھ کو معاف کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھی طرح سے ہاتھ ملاؤں۔ مگر آپ کی کوتاہی کے سبب سے آپ کا دست مبارک ہاتھ نہیں آتا چونکہ وہ نہایت مہذب و مودب میم تھی بولی کہ مجھے اپنی کوتاہ دستی پر بڑا افسوس آتا ہے۔

انگلینڈ کے لوگ تا وقتیکہ ملاقات نہ ہو ذرا کھنچے رہتے ہیں اور اجنبی سے کم آشنا ہوتے ہیں مگر آئرلینڈ کے لوگ اگر کسی کو مجلس رقص و سرود میں بے یار و تنہا بیٹھا دیکھیں تو ملاقات ہو یا نہ ہو اس سے جا کر ملتے اور گفتگو کرتے ہیں۔ اور اگر میمیں نزدیک بیٹھی ہوئیں تو اُس پر رحم

کھاتی ہیں اور بات کرتی ہیں۔ لیکن نوجوان لیڈیاں اول بات کرنے میں شرماتی ہیں۔ مگر
جب اُن سے ملاقات ہو گئی پھر اگر وہ قابل و تعلیم یافتہ ہیں تو عاقل و تعلیم یافتہ مرد کو ایسا اپنی
گفتگو سے مسرور اور مسخر کر لیتی ہیں کہ وہ شخص خدا سے چاہتا ہے کہ وہ محفل کبھی ختم نہ ہو۔ جس طرح
ہندوستان میں نسبتوں اور پہیلیوں کے بوجھنے کا رواج ہے ویسی ہی رواج ولایت میں بھی ہے۔
شہر ڈبلن کے لارڈ پادری آرچ بشپ وہٹیلے جن کی خدمت میں بھی مجھ کو نیاز تھا بڑے منطقی
اور لطیفہ گو مشہور رہتے ان کی بھانجی اور صاحبزادی دونوں عربی زبان میں میری شاگرد ہیں
ان لارڈ پادری کا ذکر ہے کہ ایک بار محفل میں کسی فوجی افسر نے جوان کا دوست تھا بے تکلف
ہو کر نسبت بجھانے میں دل لگی سے پوچھا کہ گدھے اور لاٹ پادری میں کیا فرق ہے۔ پادری
صاحب نے سوچ کر جواب دیا کہ صلیب گدھے کی پیٹھ پر ہوتی ہے اور لاٹ پادری کے سینہ
پر۔ یعنی گدھے کی پیٹھ پر سیاہ داغ بشکل صلیب بنے ہوتے ہیں۔ اور لاٹ پادری تمغہ کے
طور پر اپنے سینہ پر صلیب رکھتا ہے۔ اب لاٹ پادری صاحب کی باری تھی۔ اُنھوں نے
کہا ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ گدھے اور فوجی افسر میں کیا فرق ہے۔ افسر نے تھوڑی دیر غور کیا
اور کہا ہمیں نہیں معلوم یہ سُن کر پادری صاحب بولے بے شک ہمیں بھی کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا
اس جواب پر محفل میں قہقہہ پڑا۔

ولایت میں جو سوانگ وغیرہ ہوا کرتے ہیں اُن میں اکثر زن و مرد باہم بوسہ بازی کرتے
ہیں۔ یہ دیکھ کر دیکھنے والوں میں ایک قسم کی بے تابی ہوتی ہے۔ مگر دیکھتے دیکھتے عادت پڑ جاتی
ہے۔ اہل یورپ نے اور علوم کی طرح علم موسیقی میں بھی کمال ترقی کی ہے۔ ہزاروں لاکھوں
کتابیں اس فن میں تصنیف کر ڈالیں۔ مملکت اٹیالی کے گانے والے۔ جرمنی میں بجانے والے
فرانس میں ناچنے والے بے مثل پیدا ہو گئے ہیں۔ اور انگلستان میں جس قدر موسیقی علم کے
ماہر اور آئرلینڈ میں جس قدر شاعری کا مذاق ہے اور ملکوں میں نہ ہوگا۔ بعض گنوار لڑکیوں کے آگے
مشکل سے مشکل کچھ گاؤ فوراً وہ گنگنا کر اسی طرح سب کو سنا دیں گی۔ اندھا فقیر جو محض جاہل ہے

وہ بھی جب سنا دے گا تو کہے گا کہ شعاع نورِ الٰہی آپ کے چہرے پر تاباں ہو۔ طامس مور صاحب جس نے کتاب لالہ رخ انگریزی میں تصنیف کی ہے تغزل میں آج کوئی شاعر اس کا نظیر نہیں ہمارے ڈبلن کے ایک دوکان دار کا لڑکا تھا۔ اپنے کمال ذاتی سے لندن میں اس عروج کو پہونچا کہ بڑے خاندانی اُس پر رشک کرتے ہیں۔ اُس نے اس کتاب میں ایک شاہزادی کا قصہ نثر و نظم میں لکھا ہے۔ درحقیقت موتی پروئے ہیں۔ بہت سے ترانے اور نغمے مور کے یورپ میں مشہور رہیں مگر راگنی جس میں وہ گائے جاتے ہیں آئرلینڈ کی ہے بعض بعض تو ایسے دل کش ہیں کہ اگر آدمی سمجھے تو وجد کر جائے مگر گانے والا خوش آواز اور موسیقی کا جاننے والا ہو اور اگر سننے والا سمجھ دار اور صاحب ذوق نہ ہو تو اُس کے نزدیک وہی ہوگا کہ جیسے ہندوستان کے ایک شہزادے نے ولایت کا گانا سن کر کہا تھا کہ جیسے بلیاں لڑتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہند کا راگ نہایت آسان و سادہ ہے اور یورپ کے رنگ و ڈھنگ سے بالکل علٰحدہ ہے۔ انگلستان و ہندوستان کے راگ کی ابتدا اور الف بے جس کو میزان کہتے ہیں ایک ہی ہے یعنی وہی سات سُر سرگم کے وہ بھی الاپتے ہیں اور یہ بھی لیکن یہ راگنیاں جو ہند میں ہیں وہاں کوئی نہیں جانتا۔ اور راگ ہر وقت ہر فصل کے مثلاً ملار، بسنت، ہولی وغیرہ وہاں نہیں ہیں اور جو ترکیبیں راگوں کو دی ہیں وہ بھی یہاں وہاں کی الگ ہیں۔ لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اہل ولایت نے باوجود اس مشکل ہونے کے انواع و اقسام کے باجے اور طرح طرح کے راگ ان طریقوں سے کتابوں میں لکھے ہیں کہ سیکھنے والوں کو یہ فن آسانی سے حاصل ہو جائے۔ ولایت میں عورت کے لئے تعلیم میں ایک جزو گانے اور بجانے کا بھی مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے جس عورت کو گانے اور بجانے میں دخل نہیں اُس کی تعلیم ناقص ہے۔ جب کوئی شریف شخص کسی مہذب کے گھر شام کو ملاقات کے لئے جاتا ہے تو اکثر عورتیں اس مہمان کی خاطر سے گاتی اور بجاتی ہیں۔ اگر اس سے طبیعت بھر گئی تو کتابیں، تصویریں، گنجفہ، شطرنج، نرد سے دل بہلاتی ہیں۔ یہ جملہ سامان موجود رہتا ہے۔ اہل ولایت کا یہ حسنِ اخلاق ہے کہ ہمہ تن وہ مہمان کی خاطر کے لئے معروف

ہو جاتے ہیں۔ وہاں کے باتہذیب لوگوں کی صحبت میں فحش الفاظ کا مطلق ذکر نہیں آتا حتی کہ جہنم شیطان اعضائے ستر کا ہرگز نام نہیں لیتے ایک بار ایک ذی لیاقت میم نے از راہ بے تکلفی مجھ سے کہا کہ اہل ہند کو یہاں کے لوگ اکثر جنگلی و وحشی سمجھتے ہیں۔ مگر منشی جی ہم تم کو ایک مدت سے جانتے ہیں اور آپ کی زبان سے گفتگو سنتے ہیں مگر کوئی ایسا امر جیسے انگلستان کے شائستہ اور تعلیم یافتہ لوگ معیوب جانتے ہیں تمھاری زبان و حرکات و سکنات سے نہیں ظاہر ہوا۔ میں نے کہا کہ بیشتر بھی میری عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ کے شاہی خاندان میں بسر ہوا اور اب بھی علمی مشاغل میں میرے اوقات ختم ہوتے ہیں۔ نہ منہ سے کوئی لفظ غیر مہذب نکلتی ہے نہ سننے میں آتی ہے۔

اپنے لکچر کے سلسلہ میں انگریزوں سے ملنے کے متعلق ہندوستانیوں کو بہت نصیحتیں کیں چنانچہ فرمایا کہ حکام انگریزی جو ہندوستانیوں کو اپنی صحبت (سوسائٹی) سے علٰحدہ رکھتے ہیں اس کا باعث یہی ہے کہ ان سے بعض اوقات نادانستہ وہ امور سرزد ہوتے ہیں جن سے ان کو نفرت ہوتی ہے۔ جب وہ امور چھوڑ دو تب اہل یورپ سے ملو۔ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ انگریزوں کے سامنے ڈکار نہ لیں۔ اُن سے ملنے کو جائیں تو بغیر جرابیں وغیرہ پہنے نہ جائیں۔ انگرکھے کے نیچے شلوکے کا ہونا ضروری ہے۔ سخت الفاظ لعنت اور نفریں کے زبان پر نہ لائیں۔ میل وغیرہ کے پوچھنے میں بجائے رومال کے ہاتھ سے کام نہ لیں۔ سینے کے نیچے سے گھٹنوں تک کسی اعضا کا نام نہ لیں۔ جہاں ان کی عورتیں بیٹھی ہوں وہاں دل لگی اور فحش کلمات کا استعمال نہ کریں۔ اسی طرح انگریزوں کو ہدایت کی کہ جب وہ ہندوستانیوں سے ملنے کو آئیں اور ہمارے فرش پر آنا ہو تو جوتا اُتار کر آئیں جیسے وہ اپنی کرسیوں اور دنگلوں کے اوپر جوتا پہن کر نہیں جاتے ہیں ویسے ہی ہمارے فرش پر جوتا پہن کر آنا اُنھیں مناسب نہیں ہے۔ اہل ولایت علم و ہنر کے بڑے قدردان ہیں۔ اور فقط علم کی ترقی سے اُن کی یہ ترقی ہے۔ شرفا کی عورتیں سب خواندہ ہوتی ہیں اور چھوٹے لڑکے جب تک ماں کے پاس رہتے ہیں اُنھیں سے تعلیم و تربیت پاتے ہیں اور گھر میں علم کا چرچا دیکھ کر اُن کو علم کی ترغیب ہوتی ہے۔ جو عورت

شعر و سخن میں طاق اور دل آویزی و لطیفہ سنجی میں شہرہ آفاق ہو اس کی قدر اس کے شوہر کے دل میں جس قدر ہو گی ظاہر ہے۔ ولایت کے ہر محلہ میں ایک دار الشفا، ایک مدرسہ اور ایک کلیسا موجود ہوتا ہے جو غریب مریضوں، طالب علموں، عبادت کرنے والوں کے لئے وقف ہوتا ہے۔ گیاس کی روشنی ہر جگہ مہیا کر دی گئی ہے۔ در اصل گیاس پتھر کے کوئلے کا نچار ہے۔ ہر چیز علمی تحقیقات سے نکالی۔ تعلیم کی ترقی سے انگلستان میں دولت کی ترقی ہوئی۔ ولایت میں لوگ روپیہ صرف کر کے علم و ہنر سیکھتے ہیں، اور ہندوستان میں گورنمنٹ کچھ اپنے پاس سے خرچ کر کے اسکول کھولتی ہے جب بھی بعض نہیں پڑھتے سے

عجب متاع زبون است ایں وفاداری
کہ مفت ہم نخرید ند ہر کجا بردیم

انگلستان کے مکانات میں چمن بندی کا بہت رواج ہے جن کی شان میں یہ شعر صادق آتا ہے سے

گلوں کی جو سبزے میں تھیں کیاریاں
وہ تھیں سبز مخمل پہ گلکاریاں

تمام عالم کے پھل و پھول لاکر جمع کئے ہیں اور نباتات کے علم میں بڑی ترقی کی ہے میووں اور ترکاریوں میں ایسی ترکیب کو دخل دیا ہے کہ ان کا قد و قامت اصلی ہیئت سے کہیں بڑھ گیا ہے۔ شیشے کی عمارت پر ہر ایک ملک کے موافق سرد گرم ہوا قایم کی اور وہاں کے درخت نصب کئے گلاب کے پھول جیسے خوش رنگ و بڑے اور مختلف قسم کے وہاں دیکھے دنیا میں نہیں دیکھے یہ دخل صرف نباتات و زراعت میں نہیں بلکہ حیوانات کا بھی یہی حال ہے۔ عرب کے گھوڑوں سے ملا کر ایک نسل ایسی پیدا کی ہے کہ روئے زمین پر اس کی نظیر نہیں۔ نہایت قد آور جوہردار گھوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ شہنشاہِ روس بھی اپنے واسطے یہاں سے گھوڑے منگاتے ہیں۔ چند رؤسائے ہند نے بھی وہاں کے گھوڑے خرید کئے۔ اگرچہ عرب اثنائے راہ میں تھا

مگر نہ خریدے۔ میں نے بچشم خود قصبہ نیمپٹیوں کی گھوڑ دوڑ میں یہ گھوڑے دیکھے ہیں۔ ولایت میں زندہ حیوانات کا عجائب خانہ بے مثل ہے۔ چرند و پرند جملہ اقسام کے جانور اکٹھا کئے ہیں۔ ایک سفید ریچھ جیسے روئی کا گالا ظلمات سے لاکر رکھا ہے۔ وہ اکثر پانی میں اور کبھی خشکی میں رہا کرتا ہے افریقہ کے شیر ببر بھی میں نے وہیں دیکھے۔ ایک مکان میں مردہ حیوان اور جمادات جمع کئے ہیں۔ ہزاروں برس کی لاشیں مصر وغیرہ سے لائے ہیں۔ ایک لاش ان میں قبل طوفانِ نوحؑ کی ہے۔ پرانے ظروف جدید و قدیم سکے عجب عجب چیزیں ہیں۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ قابلِ دید کھولا ہے۔ جس میں قدیم علم و زبان کی کتابیں ہزارہا برس کے پرانے حروف و خطوط موجود ہیں ایک تختی طلائی قدیم فارسی کی جو ایران کی ایک عمیق زمین سے نکلی تھی انگریزوں نے حاصل کی۔ اور کوئی اس کو نہ پڑھ سکا تھا مگر انھوں نے پڑھی۔ غرض کہ یہ مقام اشیائے عجیبہ کا مجمع اور علوم و فنونِ غریبہ کا مدرسہ ہے۔ صاحبان فضل و کمال کا وہاں جمگھٹا رہتا ہے۔ جو کوئی وہاں تعلیم کو جائے مفت پڑھ سکتا ہے۔ ہر ہفتہ میں تین روز عوام کے لئے یہ میوزیم کھلا رہتا ہے۔ اس عجائب خانہ میں بڑے بڑے عالم اور محقق ہر فن کے ملازم ہیں۔ منجملہ ان کے ایک میرے بڑے دوست ڈاکٹر چارلس ریو صاحب ساکن جنیوا جو علاوہ زبان ہائے یورپ کے مشرقی زبانوں میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ یہ بھی عجائبات زمانہ سے ہیں۔ دوسرے ولیم رائٹ صاحب ہیں جو زبان عربی و عبرانی و سُریانی وغیرہ کے عالم ہیں۔ انھوں نے ایک نہایت عمدہ کتاب صرف و نحو عربی کی انگریزی زبان میں تصنیف کی ہے۔ اس سے پیشتر کوئی ایسی کتاب انگلش میں نہ تھی یہ صاحب میرے قبل ڈبلن یونیورسٹی میں عربی کے مدرس تھے۔ اب میں بجائے ان کے اس عہدے پر سرفراز ہوا ہوں۔ علاوہ ان باغات و مکانات کے ایک اور مقام ہے جہاں ہفت اقلیموں کے کاریگر لاکر جمع کئے ہیں۔ تاکہ انگلستان کے صناع ان کے کاموں کو دیکھ کر سب کام سیکھیں۔ دس بارہ برس کے بعد لاکھوں روپیہ صرف کر کے ایک نمایش کھولی جاتی ہے جس میں تمام دنیا کی چیزوں کے نمونے لاکر رکھے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو ولایت کے کس

کاریگر نے کس فن میں کتنی ترقی کی ہے اور کس کو تنزل ہوا۔ ہمارے ہندوستان کے کاریگر بیچارے ان فائدوں سے محروم ہیں تو بھی مونگیر کے آتشی ہتھیار اور کشمیر کی شال، ڈھاکے و بنگالے کی ململ و جامدانی، دلی و بنارس کی زردوزی، بمبئی کی نقاشی اور دیگر ملکوں کی چیزیں قابلِ تعریف نکلیں۔ میرے نزدیک ہندوستانی کاریگر بہت دستکار ہیں کہ بلا ان تعلیمات کے بھی وہ اپنی قدیمی صناعی ایسی اچھی دکھلاتے ہیں کہ جو یورپ والے ان تعلیموں اور امداد کے بعد دکھایا کرتے ہیں۔

مرزا اسکندر حشمت بہادر مرحوم جو چھوٹے بھائی حضرت واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے تھے اُن کے پاس ایک تاج سبز مخمل کا تھا۔ جس پر سنہرے ستاروں کا کام بنا تھا وہ ذرا میلا ہو گیا۔ انھوں نے لندن کے ایک بڑے کاریگر کو بلا کر کہا کہ ایسا ایک تاج ہم کو بنا دو اُس نے جواب دیا کہ ایسا کام ہرگز یہاں نہ بن سکے گا۔ حالانکہ وہ لکھنؤ کا کام تھا اور ستارے اس خوبی سے ٹانکے تھے کہ تھوڑی دور سے ایک سونے کا ڈلا نظر آتا تھا۔ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کا کام ہے۔ بہت چیزیں ہند میں بنتی ہیں جو ولایت میں نہیں بن سکتیں۔

کلب جو وہاں قایم کئے گئے ہیں اُن کے ذریعہ سے ہر قسم کے لوگوں سے ملاقاتوں اور مبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے۔

بیمہ کی کمپنی سے اصل شخص کے مرنے کے بعد اُس کے ورثا کی امداد و پرورش ہوتی ہے۔

ولایت میں جو تماشے کئے جاتے ہیں اُن سے بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ دن بھر کی محنت کے بعد جب شام کو واپس جاتے ہیں دل فکروں سے خالی ہو کر فرحت و سرور حاصل کرتا ہے اور تکان بھی رفع ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ جو بیان کتابوں میں پڑھا ہے ان کی وہاں چل کر تصویر دیکھیں۔ بعض شخص اعلیٰ درجہ کی زبان و لہجہ سے مسرور ہوتے ہیں بعض حسن و جمال کے مشاہدے کے لئے جاتے ہیں۔ کوئی موسیقی کے کمال جو ناچ باجے سے ظاہر ہوتا ہے حظ حاصل کرتے جاتے ہیں غرض ؎

سمجھ لیتے ہیں مطلب اپنے اپنے طور پر سامع   اثر رکھتی ہے آتش کی غزل مجذوب کی بڑ کا

فرانس میں در اصل طلسم کرتے ہیں ایک پرستان زرنگار دکھاتے ہیں جس میں سیکڑوں زندہ پریاں زرق برق لباس پہنے ہوئے باغوں درختوں پہاڑوں نہروں مکانوں کے جھروکوں میں کھڑی جھکی لیٹی بیٹھی انگڑائی لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مختلف رنگ کی مہتابوں کی روشنی نظر کو چکا چوندھ کر دیتی ہے اور عین اشتیاق و محویت اور تالیوں کے شور میں وہ پریاں وہ تماشہ دفعۃً آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ولایت میں بعض عورتیں بڑھیوں کو جوان بنا دیتی ہیں۔ اگر دانت نہ رہے ہوں تو مصنوعی دانتوں کی بتیسی لگا دیں۔ اور اگر بال سفید ہو گئے ہوں تو سیاہ بالوں کی ٹوپی سر پر چڑھا دیتی ہیں چہرے کی جھریاں مٹا کر ایسا رنگ و روغن لگاتی ہیں کہ سارے بدن میں نرمی و نزاکت اور چہرے میں جوانی کیسی تر و تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی قسم کی عورتوں میں ایک مسماۃ میڈم راشل تھیں۔ انھوں نے اشتہار بھی دیا تھا کہ میں بڑھیوں کو جوان بناتی ہوں۔ ان کے پھندے میں ایک مالدار رنڈی بی مسیس باروڈل آپھنسیں جوانی کے شوق اور شادی کے ذوق میں قریب ایک لاکھ روپیہ صرف کیا۔ کچھ دنوں کے لیے ظاہری زینت ہو گئی۔ اس حالت میں لارڈ رنیلا صاحب نے عقد کا پیام بھی بھیجا مگر چند روز میں اس حسن ناپائدار کی بہار کم ہونے لگی اور ساری قلعی کھل گئی بالآخر میڈم راشل پر عدالت میں دعویٰ ہوا اور وہاں ثابت ہوا کہ بہت سی عورتوں کو انھوں نے جوان بنایا اور ان کا مال خرد برد کیا۔ آخر کو میڈم راشل قید کی گئیں۔

حضرات مجھ کو افسوس ہے کہ میرا لکچر اس قدر طول کو پہونچا مگر میں نے ایک حصہ بھی اب تک سو حصوں سے عرض نہ کیا۔ انشاء اللہ آئندہ حالات پیدائش و تعلیم و شادی و وفات و محکمہ پالیمنٹ اور انگریزوں کی عبادت دگر جاؤں کا بیان کروں گا۔

اب لکچر ختم ہوا انگریز بہت خوش ہوئے اور اپنے معمول کے مطابق سب نے تالیاں بجائیں۔ اور ہندوستانیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

اس کے بعد پریسیڈنٹ صاحب نے کھڑے ہو کر نہایت اچھے الفاظ میں لکچر کی تعریف کی۔ سید صاحب کی علمی قابلیت و نظر غائر اور وسعت اخلاق کی مدح سرائی کی۔ یہ سن کر سید صاحب کھڑے ہو گئے اور پریسیڈنٹ صاحب کی عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ پھر یہ فرمایا کہ میں اس وقت تھک گیا ہوں اور کھڑے ہو کر بیان کرنے سے معذور رہوں ورنہ جی کھول کر اس مرحمت کا شکریہ ادا کرتا۔ بعد ازاں نواب مشکور الدولہ بہادر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ جناب لکچرار صاحب کی بڑی عنایت ہوگی اگر انجمن جلسۂ تہذیب کو اس لکچر کے شائع کرنے کی اجازت فرمائیں گے۔ اور یہ ایسی عنایت ہوگی کہ تمام ممبران انجمن جلسۂ تہذیب تہ دل سے شکرگزار ہوں گے۔ لکچرار صاحب نے اجازت دی۔ اور پریسیڈنٹ صاحب کا شکریہ ادا ہونے کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

کارروائی جلسہ کی ختم ہونے کے بعد سیّد صاحب اور انگریز حاضرین جلسہ میں دیر تک انگریزی میں باتیں ہوتی رہیں۔ بعض انگریزوں نے دریافت کیا کہ آپ یہاں کہاں مقیم ہیں اور ملاقات کے لئے آئندہ وعدہ کیا۔

اودھ اخبار کا بیان ہے کہ اکثر لکچروں میں معمول ہے کہ انگریزی میں ہو تو اردو دانوں کو اور اردو میں ہو تو انگریزی دانوں کو بہت کم مزہ آتا ہے۔ اس کے خلاف اس لکچر میں خاص کیفیت یہ تھی کہ دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے زیادہ لطف آیا۔ پیشتر اس لکچر کا تذکرہ ہندوستان کے مختلف اخباروں نے چھاپ کر شائع کیا۔ بعد ازاں اس لکچر کا خلاصہ لندن ٹائمس سٹرڈے ریویو مارننگ پوسٹ انگریزی اخبارات نے بھی چھاپ کر یورپ میں شائع کیا۔ اور ان سب انگریزی اخباروں میں شاہ آباد کے لائق لوگوں کا ذکر بھی تحریر کیا گیا۔ سب سے پہلے اس لکچر کو جلسۂ تہذیب میں پنڈت شیونراین صاحب سکریٹری و ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے اصرار سے چھپوایا گیا۔ بعدہٗ منشی نولکشور صاحب نے طبع کرایا۔ اودھ کے انگریزی حکام میں اس لکچر کا بہت چرچا ہوا۔ اور انھوں نے انگریزی میں اس کے ترجمہ کرنے کے متعلق رائے قائم کی۔ اور اسی دوران میں دو خط علم دوست صاحبوں کے انگلستان سے

منشی میر اولاد علی صاحب کے نام آئے کہ یہ لکچر انگریزی زبان میں رسالہ کی صورت سے مرتب کیا جائے۔ غرض کہ اس کو شہرت و مقبولیت بہت حاصل ہوئی۔

اتفاقاً اسی زمانہ میں مختار الملک نواب سر سالار جنگ میر تراب علی خاں بہادر مدار المہام ریاست حیدر آباد کلکتہ میں شرکت دربار کر کے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے چونکہ اہل علم کے قدر دان تھے نہایت خصوصیت کے ساتھ میر اولاد علی صاحب سے ملے اور یورپ کی تعلیم اور دیگر معاملات یورپ پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اسی اثناء میں سید صاحب کے منجھلے بھائی افسر الاطبا حکیم سید فرزند علی صاحب بھی کلکتہ سے واپس آ گئے تھے۔ جن کو چھوٹے بھائی کی جدائی نہایت شاق تھی اور یہ گوارا نہ تھا کہ پھر ممالک دور دراز میں جا کر اقامت گزیں ہوں۔ ان کا اصرار ہوا کہ سید صاحب سر سالار جنگ سے مل کر حیدر آباد میں تعلق ملازمت کر لیں سید صاحب نے ہم خیال دوستوں اور بعض یورپین شاگردوں سے جو یہاں موجود تھے مشورہ لیا۔ ہندوستانی احباب واعزہ نے جو مشورہ دیا ہو۔ مگر آپ کے شاگرد کرنل ترو نے جو صوبہ اودھ میں کمشنری کے عہدہ پر مامور تھے سخت مخالفت کی۔ باوجودیکہ وہ نواب مختار الملک بہادر کے بڑے دوست تھے مگر حق شاگردی کے ادا کرنے کے جوش میں محترم اُستاد سے صاف کہہ دیا کہ آپ کسی ریاست میں ملازمت نہ کریں اور امیدواری کے لئے نواب مختار الملک کے پاس ہرگز نہ جائیے۔ ان کا یہ قطعی فیصلہ سُن کر سید صاحب نے کہا۔ مجھے خود منظور نہ تھا مگر بعض اعزہ کا اس قدر اصرار رہے کہ ان کے مجبور کرنے پر آپ سے مشورہ لیا۔ اس کے بعد اگرچہ سید صاحب اور نواب سر سالار جنگ بہادر سے خط و کتابت رہی مگر انھوں نے ملازمت کے بارے میں ایک حرف نہیں لکھا۔

اُدھر بھوپال میں حکیم سید فرزند علی صاحب نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ سے بھائی کی ملازمت کے لئے سلسلہ جنبانی کی بیگم صاحبہ سید صاحب کی قابلیت سے بخوبی واقف تھیں بلکہ شکر گزار تھیں تذکرہ آتے ہی منظور کر لیا۔ اب حکیم صاحب نے سید صاحب کو لکھا اور ریاست بھوپال سے

تعلق کرنے پر اصرار کیا۔ اس کا جواب سید صاحب نے یہ دیا کہ میں ولایت میں نوکر ہوں اور متعلقین رکھتا ہوں لہٰذا مجھے وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہاں پہونچنے کے بعد ان تعلقات کو منقطع کر کے واپس آؤں اور بھوپال میں ملازمت کر لوں۔

اسی اثنا میں سید اولاد علی صاحب بیمار ہو گئے اور ایک زمانہ تک لکھنؤ میں علاج کرتے رہے۔ اور اس مرض کا اصلی باعث یہ تھا کہ وہ سالہا سال سے سرد ملکوں میں رہ کے وہاں کے موسم کے عادی ہو گئے تھے۔ ہندوستان کی سخت گرمی نہ برداشت کر سکے ان امور کا تذکرہ خود سید صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو حکیم سید فرزند علی صاحب کو بھوپال میں بھیجا تھا اور خاص اُن کا دستخطی میرے پاس موجود ہے۔ ناظرین کے تفنن طبع کے لئے بجنسہٖ درج کیا جاتا ہے۔

نقل خط سید صاحب بنام حکیم صاحب

جناب اخوی صاحب قبلہ ملاذی و استاذی حکیم سید فرزند علی صاحب دام ظلہٗ العالی

بعد سلام مسنون خلاصہ مضمون آں کہ عاطفت نامہ گرامی ورود خیر آمود شرف افزائے ایں آوارہ نشین گمنامی گردید باعث ہزاراں ہزار مسرت و اطمینان شد خداوند کریم بایں عطوفت بزرگانہ دیرگاہ سلامت داراد۔ از خطوط سابقہ حال صحت کمترین دریافت شدہ باشد مگر برائے طمانیت مزاج وہاج عرض می کنم کہ الحمد للہ بعد دوائے چندیں بالوڈ اکثر خداوند کریم شفا داد فقط دو موتا دخوردہ بودم کہ تپ سیزدہ روزیک دفعہ غائب شد گویا نبود دوا بود یا اکسیر۔ حالا پرہیز نمی کنم و بدن مثل سابق بحالت اصلی بالکل نیامدہ است۔ الا روز بروز ترقی بفضلہ الحکم مزید خواہد تا آں کہ بحالت اصلی خواہد آمد۔ غرض شفائے کلی بفضل الٰہی گزدیدہ است۔ خاطر عاطر جمع باد۔ ترک روزگار برائے علالت این کمترین زیادہ اتفاق است کہ می بایست سے۔

کیم من از وجود من چہ خیزد ... ور ایں بود و نبود من چہ خیزد

بہر حال آں جناب الطاف بزرگانہ میفرمایند انچہ سزائے مربیانست اللہ تعالےٰ بدیں عطوفت و الطاف بر سرِ ما سایہ گستر دارد۔ کرم گسترا اگرچہ تمازت آفتاب وحرارت ہوا باوج خود نیامدہ است الا ہمیں قدر برائے تباہی حال مزاجم کافیست۔ و بعد از ساعت یازدہ بجز نشستن یا خفتن دل اضطرار منزل بچیزے رغبت نمی کند غرض ہیچ از دست وقلم نمی شود۔ بعد یک ماہ معلوم نیست کہ نوبت بکجا خواہد کشید۔ انچہ در بارہ مقدمہ معلومہ ارشاد شد البتہ عنایت نامہ والا رسیدہ ودر جوابش دو رقیمہ فدویت ضمیمہ ارسال شد۔ یکے از دیگرے قدرے مخالفت دارد اگر آں جناب بخدمت سرکار شرائط مندرجہ مکتوب آخریں عرض کردہ اقبال کنانند چندے قسمت آزمائی خواہم کرد۔ مگر ایں امر ملحوظ خاطر والا باد کہ رفتن راقم یک مرتبہ ولایت فرض است دگرنہ موجب بے حیائی در تمام عالم وسببِ رسوائی پیش خالقِ زمین و آسمان متصور است۔ آں جناب بہ محبت برادرانہ نیک وبد آں ملاحظہ نہ فرمودہ اند ہرگاہ پوست کندہ خواہم گفت آں وقت رائے عالی بامن موافقت خواہد کرد۔ از مختار الملک کدامی گفتگو بجز گفتگوئے علمی و حال مدارس وکیفیت کتب وعلوم کہ در مدارس ولایت جاری ست وانچہ در لکھنؤ از بلاد دیگر ساختہ می شود آں کہ کرہ ہائے مطبوعہ مروجہ اسکولہا در مطبع منشی نولکشور یافتہ می شود گفتگوئے دیگر نگردیدہ کرنل برو کہ دوست سالار جنگ و کمشنر مالی اند دہ ماہ است ممانعت قطعی کردہ بود کہ کسے درخواست روزگار از سرکار نواب نہ کند در اقسم را منظور ہم نبود مگر ارادہ دارم کہ خطے بحیدرآباد خواہم نوشت ولبس۔ واخوی سید ثنا اللہ صاحب معہ فرزند روانہ بھوپال شدند۔ زیادہ تمنائے ملازمت

والتسلیم۔ رقیمہ فدویت اولاد علی ۔ ۲۰ اپریل ۱۸۶۷ء مطابق ۱۸ محرم ۱۲۸۴ھ

از لکھنؤ محلہ سبحان نگر

اس مختصر زمانہ قیام ہند میں انگریز حکام جیسی قدر ومنزلت سید صاحب کی کرتے تھے اور کسی کی نہیں دیکھی گئی۔ میرے چچا حافظ غلام علی خاں صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار میں ان کے ساتھ ڈپٹی کمشنر ہردوئی سے ملنے گیا جیسے ہی میر اولاد علی صاحب بنگلہ پر پہونچے وہ سنتے ہی

باہر نکل آئے نہایت تپاک سے ملے۔ اندر لے گئے بڑی تعظیم و توقیر سے بٹھلایا اور ایسی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگے کہ اس سے پیشتر میں نے صاحب کلکٹر کو کسی بڑے تعلقہ دار سے بھی اس طرح ملتے نہیں دیکھا۔ چنانچہ سید صاحب ہی کی وجہ سے صاحب ضلع نے اُس دن جتنی توجہ میرے حال پر کی پیشتر کبھی نہ کی تھی۔ واپسی کے وقت بھی اُنھوں نے اپنے بنگلہ کے حدود سے باہر تک سید صاحب کی مشایعت کی اور انھیں گاڑی پر سوار کر کے واپس گئے۔

لفٹننٹ کرنل برڈ جن کا ذکر آچکا ہے آپ کے یورپین شاگردوں میں ممتاز تھے۔ انھوں نے آپ کے بھتیجے سید خورشید علی کو دہلی میں جب کہ وہ کمشنر تھے اچھی ملازمت دلوادی تھی اور محض سید صاحب کے اثر سے ان پر نہایت مہربانی کرتے تھے۔

سید صاحب کے ایک دوسرے یورپین شاگرد جن کا نام ولیم کنکیڈ تھا سیہور ایجنسی میں پولٹیکل ایجنٹ تھے اور محض ان کے لحاظ سے حکیم صاحب کے ساتھ عزیزوں کیسا برتاو کرتے تھے۔ مہاراجہ نرسنگھ گڈھ کے ملکی معاملات میں انھوں نے حکیم صاحب ہی کی وجہ سے نہایت توجہ کی تھی۔

سید صاحب کے شاگردوں میں ایک انگریز نکھل صاحب تھے جو ضلع سیتاپور میں ڈپٹی کمشنری کے عہدے پر سرفراز رہے۔ ان سے آپ ہی نے ایک اپنے عزیز حکیم سید انعام علی صاحب کو دربار میں لاٹ صاحب سے ملوانے کی سفارش کی تھی جس کے متعلق سید صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے یہ اعزاز دیا گیا ہے کہ دربار کے موقع پر اپنے جس عزیز یا دوست کو چاہوں دربار میں ہمراہ لے جاؤں یا بھجواؤں اور میری ہی سفارش پر سید انعام علی کو نواب گورنر جنرل سے جو پہلے اس سے لارڈ لفٹننٹ ان ممالک میں رہ چکے ہیں ملنے کا موقع ملا ہوگا۔

آپ کے شاگردوں میں ایک یورپین ولیم صاحب تھے جو عرصہ ہوا الہ آباد میں کمشنر رہے ہیں۔ اُن کو آپ نے ایک چٹھی سید محسن علی و خورشید علی کی ملازمت کے بارے میں لکھی تھی

اور اس امر کا ذکر سید صاحب نے ایک خط میں اپنے بھائی حکیم سید فرزند علی صاحب کو تحریر فرمایا ہے اور وہ خط راقم نے خود پڑھا ہے۔

سید صاحب کے قابل شاگردوں میں مسٹر پالیور نچوڈلیس اور کیو وغیرہ مشہور انگریز ہیں یہ جملہ صاحبان کیمبرج یونیورسٹی اور اکسفورڈ یونیورسٹی کے کالجوں میں اردو زبان پڑھانے پر مقرر رہے ہیں۔

ولایت سے سید صاحب صرف ایک سال کی رخصت لے کر وطن آئے تھے جو زمانہ لکھنو اور بھوپال کی آمد و رفت میں خرچ ہو گیا۔ بعض ضروری کام باقی تھے جن کے لئے انھوں نے اپنی رخصت میں چھ ماہ کی توسیع کرائی اور قریب ڈیڑھ سال کے ہندوستان میں رہ کر یورپ واپس گئے اور ڈبلن کالج میں اپنی خدمات مفوضہ انجام دینے لگے۔

ولایت کی زندگی مابعد

سید صاحب اگرچہ فرائض منصبی کے ادا کرنے سے عدیم الفرصت تھے مگر لوگوں کے اصرار سے اپنی ذات پر جفاکشی گوارا کر کے تھوڑا وقت شایقین تعلیم کے لئے نکالا چنانچہ وقت معینہ پر درس دیا کرتے اور اس پرائیویٹ درس گاہ کی عام اطلاع کے لئے ایک اشتہار بھی دے دیا تھا جس کی ایک مطبوعہ کاپی راقم الحروف نے دیکھی ہے۔

اس وقت تک سید صاحب کی والدہ ماجدہ بقید حیات تھیں اور سید صاحب کبھی کبھی ان کو خرچ بھی بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلی بار منشی اشرف علی نام ایک شخص کے ہاتھ جو خاندان شہریاری اودھ کے برگشتہ بخت قافلہ کے ساتھ ولایت جا کر واپس آئے تھے پانسو روپیہ معظمہ محترمہ کی نذر کے لئے بھیجے تھے مگر اس رقم کا زیادہ حصہ ان متدین بزرگ ہی کی نذر ہو گیا بعد ازاں مولوی محمد شاہ صاحب کے ہاتھ اپنی مادر مخدومہ کی خدمت میں ایک معتدبہ رقم بھیجی تھی۔ مولوی صاحب ممدوح نے مصر میں پہونچ کر وہ رقم شیخ خدا بخش صاحب ایک دولتمند

تاجر کے پاس امانت رکھوائی اور کہا کہ میں بیت اللہ سے واپس آکر یہ رقم آپ سے لے لوں گا
اس کے بعد مولوی صاحب موصوف مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں کئی سال قیام
پزیر رہے۔ اس دوران میں سوداگر ندکور کا کاروبار بگڑ گیا اور وہ مصر سے کلکتہ میں چلے آئے
اس کے بعد مولوی صاحب، حرمین سے رخصت ہو کر بمبئی آئے اور وہاں سے سیدھے کلکتہ تشریف
لے گئے اور بھوپال کے اسٹیشن پر اگرچہ اثنائے راہ میں تھا نہ اُترے کیونکہ حکیم صاحب سے
ملاقات کے وقت روپیہ کا تذکرہ آتا جو اس وقت موجود نہ تھا۔ مگر جب مولوی صاحب کلکتہ پہونچے
تو انھوں نے سوداگر صاحب سے بعض قیمتی چیزیں منگوا کر اپنے قبضہ میں کر لیں اور پھر انھیں کے
ذریعہ سے وہ رقم وصول کر کے سید صاحب کی والدہ کی خدمت میں بھجوا دی تھی۔ اسی طرح
۲۴ نومبر ۱۸۹۶ء کو دس پونڈ (ماضی ۱۵۰) روپیہ اور ۱۸ فروری ۱۸۹۷ء کو آٹھ پونڈ حکیم فرزند علی صاحب
کے نام بھیجے۔ اور ۲۳ اپریل ۱۸۹۷ء کو حکیم صاحب نے مالیت ۱۴ کی رسید بھیجی تھی۔
ڈبلن میں سید اولاد علی صاحب نے اپنے دینی جوش میں ایک **محمدن سوسائٹی** قائم کی
تھی جس میں اکثر طالب حق انگریز جمع ہوا کرتے اور آپ محققانہ فصیح لکچروں کے ذریعہ سے
حقیقت اسلام کو قوی دلیلوں سے ثابت کیا کرتے اور اگر سچ پوچھئے تو انگلستان میں
تبلیغ اسلام کی بنیاد آپ ہی کی ذات بابرکات سے پڑی۔ اور اس کا بہت نمایاں اثر ہوا
چنانچہ مسٹر ڈے وون پورٹ جن کی مشہور معرکۃ الآرا کتاب اپالوجی ان اسلام حمایتِ اسلام
میں پہلے شائع ہوئی اور سید احمد خاں صاحب بانی کالج نے اس کی اشاعت میں خاص
کوششیں کیں وہ سید صاحب کے شاگرد تھے اور دینِ اسلام کی تائید میں انھوں نے جو کچھ
کیا وہ سید اولاد علی صاحب کی اُس محمدن سوسائٹی کی ہمیشہ باقی رہنے والی برکت تھی۔
مسٹر ولیم عبداللہ کوئیلم جنھوں نے لیورپول میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور نومسلم انگریزوں
کی ایک جماعت قائم کرلی۔ ان کی کوششیں بھی سید اولاد علی صاحب کی آفتابِ حقیقت کی شعاعیں
تھیں۔ اس لئے کہ عبداللہ کوئیلم بھی سید صاحب کے ملنے والوں میں تھے اور ان کی ساری

سرگرمیاں انھیں کی تعلیم کا نتیجہ تھیں۔

عبداللہ کوئلم کی نسبت سیّد صاحب اپنے ایک خط موسومہ بہ حکیم سیّد فرزند علی صاحب مورخہ ۲ مئی ۱۸۹۲ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ عبداللہ نومسلم لیورپول آج کل ڈبلن میں آنے والے ہیں جب اُن سے ملاقات ہو گی تو اس کے بعد اُن کا حال عرض کروں گا۔ وہ جرمنی کے رہنے والے ہیں اور لیورپول میں وکالت کیا کرتے ہیں۔ ایک مکان کو مسجد بنا لیا ہے اور وہاں اذان و نماز ہوا کرتی ہے اور چند اشخاص بھی ان کے ساتھ نومسلم ہو گئے ہیں۔ اگرچہ سکّانِ لیورپول نے جہالت سے ان کو اور اہل خانہ اور ہم مذہبوں کو اوائل میں بہت تکلیف دی تھی اور اُن پر پتھر وکیچڑ وغیرہ پھینکے تھے۔ مگر اب پولیس کی حفاظت سے اذیت نہیں پہونچتی ہے۔ یہ لوگ ایسے متعصب ہیں کہ اسلام ان کے نزدیک سب سے بدترین دین ہے۔ بت پرستی بھی اس سے بہتر ہے۔ ایسے جاہلوں سے کیا پیش جائے۔ مگر جہاں جہاں قدیم سے بنیاد تعصب چلی آتی تھی اب بھی وہاں لامذہبی و بغاوت ہے۔ لوگوں کو اور مکانات و گرجا گھروں کو نہ بارود سے بلکہ ڈائنامیٹ سے جس کی قوت بجلی سے بھی زیادہ ہے یہ دھڑے اور لامذہب خوب اڑاتے ہیں۔ فرانس اور اسپانیول اور روس و جرمن وغیرہ میں بلکہ خود لندن میں یہ لوگ موجود ہیں۔ چونکہ دینِ متین اور رسول رب العالمین کو یہاں والوں نے بدنام کیا اور بہت بہتان اُن پر لگائے۔ لہذا اب اس کا ثمرہ ان کو ملتا ہے۔ دین ان کا تو برائے نام ہے۔ ان سب ملکوں میں جہاں یہ سب مفسد باغی روز بروز نقصان جان و مال کا کرتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے اور مردانہ پھانسی کی آرزو کرتے ہیں۔ اُن میں الحمدللہ کوئی مسلمان شریک نہیں ہوا سب موالید نصرانیت ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا ہے کہ ہر درخت اس کے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ پس پھل مذہبیت کا یہ ہے کہ جو آج کل یورپ میں تہلکہ ڈال رہا ہے۔ نہ مال کی امان ہے۔ بادشاہ اور رفقا سب ان لامذہبوں کی شیطنت اور ظلم سے ترساں ہیں۔ عجب نہیں کہ ممالک مذکورہ میں بہت نقصان جان و مال کا ہو وے۔ ڈائنامیٹ کی آگ

ایسی ہے کہ اُس سے بچاؤ بہت دشوار ہے۔ ایک چھوٹا گولا اس سے بھرا ہوا جب پھوٹے تو بڑے بڑے مکانات کو اک دم میں خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ بارود میں تو اس کی نسبت کچھ بھی زور نہیں۔

سید صاحب نے وہاں تبلیغ کا ایسا سلسلہ جاری کیا تھا کہ انگلستان و آئرلینڈ میں اب تک کافی تعداد میں مسلمانوں کی جماعت قایم ہوگئی تھی جس کا ثبوت مسٹر ڈے ون پورٹ اور عبداللہ کوئم کے حالات سے بخوبی مل سکتا ہے۔ مگر وہاں بجز مادہ پرستی اور الحاد کے کوئی مذہب کی روحانی لذتوں سے آشنا ہی نہیں۔ مروجہ مذہب خود الحاد کا جامہ پہنتا جاتا ہے۔ ایسے نقار خانے میں حق گو طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔ یہ بھی غنیمت سمجھنا چاہئے کہ سید صاحب نے متعدد لوگوں کو اسلام کی حقیت کا قایل اور حضرت رسالت پناہ کی تعلیموں کا معترف و مداح بنا دیا تھا بھائی کے نام جو خط لکھا تھا اُس کے چند الفاظ جو ابھی نقل کئے گئے اُن سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا دل حمیت اسلامی کے جوش و حضرت سرور عالمؐ کی محبت کے نور سے کس قدر لبریز تھا۔ وہاں کے عوام کے تعصب کو وہ کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور کس خوبی سے اُنھوں نے یورپ کے موجودہ الحاد کو عداوت اسلام کا نتیجہ باور کیا۔ اور پھر جو انھوں نے پیشین گوئی کر دی تھی اس کا پورا پورا منظر گزشتہ جنگ یورپ میں نظر آگیا۔

سیّد صاحب ولایت سے اپنے برادر محترم حکیم سید فرزند علی صاحب کی خدمت میں اکثر خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ جن سے ان کے جذبات و خیالات کے ساتھ ان کی اعلیٰ قابلیت و کمال انشا پردازی کا پتہ چلتا ہے۔ اُن میں سے صرف ایک خط کو ہم نمونہ کے طور پر یہاں درج کرتے ہیں۔

خط سیّد صاحب بنام حکیم صاحب

حامداً و مصلیاً ۔ حضرت اخوی صاحب استاذی ملاذی معاذی جناب حکیم سید فرزند علی صاحب دام ظلہم

بعد تسلیمات عرض یہ کہ آپ کا عنایت بار نوازشنامہ مورخہ ۱۲ شعبان المعظم جو نہایت طویل اور سرخ کاغذ پر مکتوب تھا اور اُس کے ساتھ جو کارروائی درباب ٹیکہ چیچک وغیرہ کے آپ نے کی تھی اس کے سب کاغذات اور ایک فہرست افسران انگریزی کی جو بالفعل اودھ میں حاکم ہیں نتھی کی ہوئی تھی۔ عین انتظار میں مرہم دل دردمند ہوا۔ خداوندکریم سایہ عاطفت پایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قایم رکھے۔ آ ... ے جو فہرست ملفوف کی ہے اس میں تمام افسرانِ فوج کے نام ہیں جو بالفعل ... ہائے قلمی پر معتین ہوئے ہیں۔ اہل سیف اس قدر اہل قلم کے عہدوں پر مقرر ہوا ... سبب کیا ہے۔ میرے شاگرد ایک صاحب لفٹنٹ کرنل آف برڈ ڈپٹی کمشنر گونڈہ ہیں۔ اگر ایسا ہو تو برادر سید علی طال عمرہ سے دریافت کر لیجئے کیونکہ میں نے صاحب سے ملا دیا تھا لیکن بہت عرصہ گزرا ہے بھولے تو نہوں گے کیوں کہ میرے شاگرد ہیں۔ ان کو ایک چٹھی ملفوف بھیجتا ہوں اور سفارش برخوردار خورشید علی اور محسن علی کی کرتا ہوں۔ آپ اس کو صاحب ممدوح کے پاس بھیجدیں شاید ؎

ہمیں بیضہ برارد پر و بال

آئندہ بعد تعطیل ایسٹر کے جب میرے دوست پھر آئیں گے تو شاید ایک دو اور چٹھیاں بھی روانہ کروں فقط اگر آپ صلاح دیں تو گورنمنٹ اور پارلیمنٹ میں شور مچوا دوں کہ افسران سرکاری لیاقت پر نہیں بلکہ سفارش پر نوکریاں دیا کرتے ہیں ان کو ممانعت کی جاوے لیکن کوئی آپ کا دشمن اس بات سے فتنہ نہ برپا کرے اور صاحبان افسران سرکاری کو آپ کی طرف سے بدظن نہ کردے۔ اب درباب ٹیکہ کے جو اگر آپ فرمائیں تو گورنمنٹ سے حکام اودھ وغیرہ کے نام حکمنامہ تاکیدی لکھوا کر بھجوا سکتا ہوں۔ بلکہ بالا بالا بدوں آپ کے نام کے ایک سوال گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجوں گا اور جواب ... اس کے اطلاع دوں گا تاکہ تفصیل فوت ٹیکہ دیئے ہوئے لڑکوں کی نہ مجمل بلکہ مفصل لکھیں۔ اور ٹیکہ مواد گاوی سے دیا جایا کرے۔ جب کہ رسالہ حکیم اصغر حسین صاحب آوے گا تو اُس کی قوت پر البتہ گورنمنٹ سے

درخواست کی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹرانِ ہندی کو تاکید کی جاوے کہ وہ رجسٹر اطفال فوت شدہ کا جو فی الحقیقت ٹیکہ سے مرے ہیں صاف صاف لکھیں۔ آج کل میں پارلیمنٹ ٹوٹنے والا ہے اور چونکہ میعاد معینہ سات برس کی پوری ہوئی ہے نیا پارلیمنٹ رعایا کی رائے سے مقرر ہوگا۔ اگر اس نے وزرائے حال ملکہ معظمہ کو بکثرت رائے یا کسی سوال سے پارلیمنٹ میں شکست دی تو دوسرے وزیر پیدا کئے جائیں گے۔ پس پارلیمنٹ اور ملکہ کی وزارت کا گورنمنٹ دونوں نئے ہوں گے دیکھا چاہیئے کہ کیا ہووے۔

ہمارا مدرسہ بالفعل مرکز توجہ و التفات یورپ و ایشیا و را امریکہ اور را فریقہ اور جزائرات اور بحر و بر دنیا کا ہے۔ کیونکہ جولائی آئندہ میں اس مدرسہ کی سالگرہ سہ صدی ہوگی اور چونکہ طلبا اس مدرسہ کے تمام اطراف و اکناف عالم میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہیں اور اکثر بری و بحری افسری سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے جو لوگ اس تقریب میں شریک ہوسکیں گے وہ آئیں گے۔ سوا اس کے مدرسان مدارس اعظم ہر ملک کے مدعو ہوئے ہیں۔ ان میں سے بھی بہت شریک ہوں گے۔ غرض کہ اک بڑا ہنگامہ اور دھوم دھام ہوگی۔ حال اس کا آئندہ عرض کروں گا۔ بالفعل اتنا ہی تحریر کیا ارشاد علی اور اس کی ماں دونوں انگلینڈ میں ہیں۔ بعد بیماری کے ارشاد نے لکھا کہ تبدیل آب و ہوا کے واسطے چند روز آئرلینڈ سے انگلینڈ چلے جاویں اس واسطے میں نے بھیج دیا۔ آپ کی بھاوج اور بھتیجا دونوں ایک ساتھ ہیں عنقریب مراجعت کریں گے۔ ابھی ایک خط جناب شجاع الدین یحییٰ صاحب کا آیا اور آخر میں اس کے سعید الدین احمد صاحب کا ایک رقعہ بھی مرقوم تھا۔ اس سے حال آپ کی تشریف آوری ٹونک کا فیروز جنگ بہادر سے ملازمت ہونے کا اور بسبب ماہ صیام کے پھر قصد وطن کا سب مفصل دریافت ہوا۔ جواب اس کا اب تک نہیں لکھا عنقریب انشاء اللہ تعالے بھیجوں گا۔ جناب بھائی صاحب اس عاجز نے کئی خطوط ارسال کئے اور خط آخری دو چار روز بعد روانگی آپ کے عاطفت نامہ کے پہونچا ہوگا۔ آپ تو یہی فرماتے ہیں کہ دو سال سے

کوئی عریضہ راقم کا آپ کو نہ پہونچا سبب اس کا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اہل ڈاک کا قصور ہو تو عندالثبوت ان کو تنبیہ ہوسکتی ہے۔ ایک بار اور بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اگر اس عریضہ کے پہونچنے میں تاخیر ہوئی تو سرکار میں اطلاع کی جائے گی۔ زیادہ حدِ ادب سب اعزہ و اقربا اور احباب کو درجہ بدرجہ تسلیم و دعا اور سلام نیاز جداجدا فرمادیجئے گا۔ والتسلیم۔

رقیمہ فدویت اولاد علی۔ ٹرنٹی کالج ڈبلن آئرلینڈ۔ ۲ مئی ۱۸۹۲ء

ان کی بیوی کو بے انتہا شوق تھا کہ قابل شوہر کی سوانح عمری ان کی زندگی میں شائع ہوجائے مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد مسز اولاد علی نے جو خط اپنے جیٹھ حکیم سید فرزند علی صاحب کے نام یکم ستمبر ۱۸۹۸ء کو لکھا تھا اُس میں تحریر کرتی ہیں کہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے پیارے بھائی کی سوانح عمری لکھوں اور اُن کی بعض تصانیف کو چھپواؤں۔ میں نہایت خوش ہونگی کہ اگر آپ اُن کے کچھ حالات جو مؤلف کے واسطے مفید ہوں تحریر فرمائینگے میرے پاس ہندوستانی اور فارسی میں ان کی بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن سے کس طرح فائدہ اُٹھایا جائے۔ کیوں کہ مجھے افسوس ہے نہ فارسی آتی ہے نہ ہندوستانی۔ انگریزی تحریروں سے کچھ مطلب نکال سکتی ہوں۔ لیکن جانتی ہوں کہ وہ ہندوستانی تحریریں بہت زیادہ بکار آمد ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ آپ اپنے پیارے بھائی کے خاندان کے پورے حالات سے مطلع فرمائیں گے۔ میری خواہش تھی کہ میرے عزیز شوہر اپنے سوانح عمری اپنی زندگی میں خود ہی لکھتے۔ میں نے بارہا اُن سے اس بات کی استدعا کی اور خوشی سے تیار تھی کہ اس کام میں اُن کو مدد دوں اور چوں کہ مجھے اس وقت مہلت تھی اس وجہ سے امید تھی کہ انھیں میں کافی مدد دیتی۔ یہ کام بالکل نئے قسم کا ہے۔ ان کی اکثر تحریریں ان کی زبان میں ہیں۔ اور جس قدر انگریزی میں ہیں وہ ایسے متفرق ٹکڑے ہیں کہ بجز ان کے اور کوئی شخص اُنھیں بمشکل مرتب کرسکتا ہے جس میں اکثر مطبوعہ کاغذات اخباروں کے کٹے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ ان کو وہی ترتیب سے سلسلہ ملاکر چھپوا سکتے تھے میں خیال

کرتی ہوں کہ کالج کے حکام بھی اسی وجہ سے راضی نہیں ہیں کہ ہم لوگوں نے کوئی ایسی چیز نہ لکھی اور نہ چھپوائی کہ جو اُن کے بکار آمد ہوتی۔ میرے شوہر میں اگر میری ہی مستعدی ہوتی اور مجھے ان کی لیاقت میں سے کچھ حصہ ملجاتا تو ہم دونوں مل کر بہت کچھ کر لیتے۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ میرے ہی بھروسہ پر کام کرتے تھے۔ اور میں ہمیشہ اسی فکر میں رہتی تھی کہ گھر میں علم والے لوگوں کی آمد و رفت بڑھے۔ مجھے ان کی زبان سیکھنے کا موقع نہ ملا جس سے مجھے اب بڑا فائدہ ہوتا۔ لیکن ایک شخص ہر کام کو عمدہ طور سے نہیں انجام دے سکتا ہے۔ میری تمنا تھی کہ میں ان کے وطن کو دیکھتی۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں جب کہ وہ اپنے مکان پر گئے تھے وہ اُس وقت مجھ کو اور میرے پیارے چھوٹے کو اپنے ساتھ لے جاتے اور وہاں رکھتے لیکن اس کے واسطے میں اُن کو راضی نہ کر سکی۔

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی میم صاحبہ کو اُن کی لائف کے شائع ہونے کی بے حد آرزو تھی جس کی خواہش پہلے شوہر سے کرتی رہیں۔ پھر ان کی وفات کے بعد خود لکھنے پر آمادہ ہوئیں لیکن شوہر کے غیر معمولی صدمہ سے وہ ایسے افکار و آلام میں مبتلا ہو گئیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس خیال سے دست بردار ہونا پڑا اور جب خود بن نہ پڑا تو اپنے دیور مولوی سید علی صاحب کو اس بارہ میں لکھا اور مولوی صاحب موصوف نے آمادگی ظاہر کی۔ اور میم صاحبہ نے ارشاد علی کے بارہ سارٹیفکٹ اور اپنا اور اپنے عزیز شوہر اور ارشاد علی کے فوٹو بھیج دیئے مگر مولوی سید علی صاحب نے چند ہی روز میں ہمت ہار دی۔

اس زمانہ میں راقم نے استادی معالج الدولہ حکیم سید فرزند علی صاحب افسر الاطبّاء کی سوانح عمری لکھنا شروع کی تھی۔ مولوی صاحب ممدوح نے سید اولاد علی صاحب کی لائف لکھنے کا اصرار بھی کیا اور جملہ سارٹیفکٹ و پوٹری سالگرہ اور وہ فوٹو جو سید اولاد علی صاحب کا روم سے واپسی کے وقت بازار کوہ نور میں لیا گیا تھا حوالہ کر کے احقر پر یہ بار ڈال دیا۔ جب حکیم صاحب مبرور کی سوانح عمری لکھ کر ختم کر چکا تو سید صاحب کی لائف لکھنے کی نوبت آئی۔

مواد کی جستجو کرنا پڑی بہزار دقت یہ حالات فراہم ہوسکے جو ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ تلاش کاغذات کا ادنےٰ درجہ یہ ہی کہ آٹھ دس بار لکھنؤ جانا پڑا کیونکہ وہ وہاں ملازم ہوئے اور رہے سہے تھے اور ولایت سے جب ۱۸۷۹ء میں وطن آئے ہیں تو سیّد صاحب کے دوست مرزا عباس بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر نے سید صاحب کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت سا مواد خود سید صاحب سے حاصل کیا تھا مگر مرزا صاحب موصوف کے انتقال ہوجانے سے یہ لکھنا ملتوی ہوگیا۔ چونکہ اس واقعہ کو پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا اور وہ لوگ مرکھپ گئے ان کاغذات کے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا اور اس امر کا بھی دلی افسوس ہی کہ جو کاغذات ان کی میم صاحبہ کے پاس ولایت میں مثل سارٹیفکیٹ وغیرہ تھے وہ نہ دستیاب ہوسکے ورنہ مفصّل واقعات معلوم ہوتے اور بہت سے کارنامے سیّد صاحب کے اس سوانح عمری میں درج ہوتے۔ راقم نے اس بارہ میں بھی پوری کوشش کی۔ ڈبلن کالج کے پرنسپل آئی ایچ برنرڈ صاحب کو خط لکھا مگر انھوں نے یہ جواب دیا کہ مسز اولاد علی کے مرجانے سے اب ان کاغذات کا پتہ نہیں چل سکتا۔

وفات حسرت آیات

ماہ اگست ۱۸۹۸ء مطابق شہر ربیع الاول ۱۳۱۶ھ کو یکایک سید اولاد علی صاحب کے فرزند ڈاکٹر ارشاد علی کا ایک خط حکیم سید فرزند علی صاحب کو ملا جس میں لکھا تھا کہ میرے والد یعنی آپ کے بھائی نے باوجود توانا و تندرست ہونے کے قلب کی حرکت رک جانے سے ۱۴ر جولائی ۱۸۹۸ء کو دفعتاً انتقال کیا۔

اس سانحہ ہوشربا سے سارے خاندان بلکہ سارے قصبہ کو خصوصاً حکیم صاحب کو جو صدمۂ جانکاہ ہوا خارج از بیان ہی۔ ایسے نامور لایق بھائی کی موت کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ مگر بجز صبر و شکر کے چارہ نہ تھا چونکہ وفات یورپ میں ہوئی تھی اور وہاں کوئی فاتحہ درود کرنیوالا

موجود نہ تھا۔ لہذا حکیم صاحب نے ایصال ثواب کے جملہ مراتب نہایت فیاضی و سرگرمی سے ادا کیے لوگوں کو جمع کر کے بہت سے قرآن ختم کرائے۔ مساکین و غربا کو کھانا تقسیم کیا۔ تمام ملنے والوں نے حکیم صاحب کی خدمت میں آ کر حق تعزیت ادا کیا۔ ایصال ثواب کی کاروائی کے بوجہ احسن انجام پانے کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ سید صاحب کی وفات اگرچہ کفرستان میں ہوئی مگر شب جمعہ کو ہوئی جس سے ان کی نجات کی پوری امید کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید ارشاد علی کی اس تحریر سے چونکہ سید اولاد علی صاحب کی وفات کے مفصل و مشرح واقعات معلوم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کے بہت سے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لہذا ہم اس کا ترجمہ ناظرین کے ملاحظہ میں پیش کئے دیتے ہیں۔

نقل خط ارشاد علی متعلق وفات میر اولاد علی صاحب

میرے پیارے چچا۔ واقعی یہ بڑا تعجب ہے کہ اس سے پیشتر میں نے کبھی آپ کو کوئی خط نہیں لکھا۔ لیکن اب مجھ کو بہت ہی رنج دہ حالت میں لکھنا پڑتا ہے۔ (میرے والد جو آپ کے بھائی تھے) یکایک قلب کی کمزور حرکت کی وجہ سے پنجشنبہ گزشتہ جولائی کو جب کہ وہ سوتے ہوئے تھے انتقال کر گئے۔ مرحوم آخر وقت تک بہت تندرست و توانا تھے۔ ڈبلن اور خاصکر یونیورسٹی میں جہاں انھوں نے ۳۷ سال تک ہندوستانی کرسی کو زینت بخشی تھی وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ اور ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ ان کی رحلت سے میری والدہ کو سخت صدمہ ہوا کیونکہ وہ لایق اور نیک شوہر تھے۔ افسوس کہ مجھے ایک نہایت نامور اور شفیق باپ چھوڑنا پڑا۔ میں نے سکرٹری انڈین سوسائٹی کو لندن میں اور سفیر ترکی کو اطلاع دی اور درخواست کی کہ سفارت کا امام جنازے کی نماز پڑھانے کے واسطے بھیج دیجئے۔ مگر انھوں نے ایک تار مجھے اس مضمون کا بھیجا کہ ہم لوگ تجہیز و تکفین ایک دن اور ملتوی کر دیں لیکن ہم یہ نہ کر سکے۔ کیونکہ ہم کل انتظام کر چکے تھے۔ وقت تو امام بھیجنے کے واسطے بہت

کافی تھا۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ سفیر صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ لندن سے ڈبلن جانے کو صرف چند گھنٹے درکار ہوں گے ہم غریب مرحوم والد کو بلا نماز جنازے کے دفن نہیں کر سکتے تھے میری والدہ اکثر والد سے ان کی حیات میں پوچھا کرتی تھیں کہ اگر کسی وقت آپ کا انتقال ہوجاوے تو میں کیا کروں ان کا جواب یہی ہوا کرتا تھا کہ جو چاہنا کرنا اور مجھے (مارنٹ جردم) یعنی ڈبلن میں جو ہمارے قبرستان کا نام ہے دفن کرنا۔ ہم نے جو ہم سے انتظام ہوسکتا تھا وہ اچھی طرح سے کیا۔ اُن کی قبر کے واسطے میں نے زمین خرید کرلی اور دو چار مہینوں میں ان کی یادگار میں ان کی قبر پر کتبہ لگایا جاوے گا۔ مرحوم بالطبع نہایت نیک و مخیر واقع ہوئے تھے جو ان کے ہاتھ میں روپیہ آتا وہ بیشتر مصرف خیر میں خرچ کر ڈالتے۔ اسی وجہ سے ان کے بعد والدہ کے واسطے کچھ نہیں بچا ہے۔ لیکن ان کو حاجتمند نہ ہونے دوں گا۔ میرے والد نے اپنی حیثیت سے زیادہ خیرات میں خرچ کردیا۔ ان کی فیاضی وسخاوت کے ثبوت بہت سے میرے پاس موجود ہیں۔ انھوں نے بیسیوں شخصوں کی تجہیز و تکفین اپنے خرچ سے کی جن کے ورثا مجبور تھے محتاجوں اور سائلوں کی آواز پر ان کے کان کبھی بند نہ ہوئے۔ جو سائل اُن سے خدا کی راہ میں کچھ مانگتا تو وہ انکار جانتے ہی نہ تھے۔ ہمیشہ ان کی تھیلی کا منھ حاجتمندوں کے واسطے کھلا رہتا تھا۔ تمام لوگ ان کی قدر و عزت کرتے تھے اور ان کی زندگی سادہ اور با امن تھی اور ان کی موت بھی ایسی ہوئی کہ ان کی موت کا بہت لوگوں کو افسوس ہوا علی الخصوص ڈبلن والوں کو جن سے مثل اصل وطن کے ان کو محبت تھی۔ والد کو اکثر گرمی معلوم ہوا کرتی تھی اور کسی تردد نے جو میرے بارے میں ایک قانونی ضرورت سے لاحق ہوا تھا ان کے خاتمہ میں جلدی کردی۔ اگر آپ مجھے بپتہ مرقومہ بالا سے خط لکھیں تو مجھ کو نہایت خوشی ہوگی۔ میری ماں کا پتہ یہ ہے ۱۲۹ لیٹر روڈ اٹھمس ڈبلن آئرلینڈ۔ میں اکثر والد سے آپ کے حالات پوچھتا تھا۔ لیکن انھوں نے بجز اس کے کہ آپ ایک لائق طبیب ہیں اور مثل والد مرحوم کے زیادہ تر خدمات بلا اجرت کیا کرتے ہیں اور کچھ نہیں بتلایا۔ مجھے یہ

بہت کرنا پڑتا ہے کیونکہ آج کل میں ایک مفلس ضلع میں کام کرتا ہوں تاہم میں خوش حال ہوں اور مثل والد ماجد کے دولتمندی کے مقابلے میں عزت اور ہر دل عزیزی کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ کالج آئندہ والد کے یادگار میں والدہ کو کچھ سالانہ رقم بطور وظیفہ کے عنایت کرے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے والد کی زبان سے واقف ہوتا مگر مجھے اس کے سیکھنے کے واسطے وقت نہیں ملا۔ میں اپنے والد مرحوم کو تا زیست یاد کرتا رہونگا وہ میرے بڑے شفیق اور صلاح کار رہتے تھے۔ میں کبھی اُن کی نصیحتوں کو نہ بھولوں گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت رکھتے تھے اور کسی شے اور مال کو مجھ سے وہ دریغ نہیں کرتے تھے انھوں نے بے شمار سخاوت کے کام کئے۔ دنیا میں اس صفات کے لوگ اب دیکھنے میں نہیں آئیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس خط کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کرالیں گے۔ مجھے جواب ضرور دیجئے گا۔ میں نے اودھ اخبار کو اس موت کی اطلاع دی ہے اور کوئی شک نہیں کہ دیگر دیسی اخبار اُس سے نقل کرلیں گے۔

ڈبلن　　　جولائی ۱۸۹۸ء　　　ارتھر اولاد علی

سید صاحب کی وفات کے واقعات کو انگلستان اور ہندوستان کے اکثر اخباروں نے بہت افسوس کے ساتھ شائع کیا۔ چنانچہ ڈبلن کے ایک اخبار السٹرڈ گراف مورخہ یکم اگست ۱۸۹۸ء نے سید صاحب کی تصویر چھاپی اور یہ حالات شائع کئے۔

" ڈبلن یونیورسٹی نے میر اولاد علی کے انتقال سے جو ۳۷ سال تک عربی اور ہندوستانی زبانوں کے پروفیسر رہے تھے بہت بڑا نقصان اُٹھایا۔ سید صاحب لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن انگریزی زبان نہایت اعلیٰ درجہ کی جانتے تھے اور اکثر کالج کی جماعتوں میں عالمانہ اسپیچیں دیتے تھے۔ ان کی شادی ایک لیڈی کے ساتھ ہوئی تھی اور اُن کے صاحبزادے ایک نامور ڈاکٹر ہیں۔ پروفیسر ممدوح نہ فقط اپنی علمی قابلیت ہی کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے خیال کئے جاتے تھے بلکہ اپنی خوش اخلاقی و عالی دماغی کی وجہ سے نہایت ہر دل عزیز تھے۔

ان کی وفات سے ان کے خاندان کو اتنا بڑا نقصان پہونچا جس کا دفع کرنا ناممکن ہی اور ان کے نہونے سے بہت سے لوگ ایک مستعد ہمدرد اور فیاض دوست کی کمی کو ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔ اُن کی تجہیز و تکفین ایک بڑے مجمع عام کے ساتھ عمل میں آئی۔ سید صاحب سے پیشتر اس پروفیسری کی خدمت ڈاکٹر ولیم رائٹ انجام دیتے رہے تھے۔ جو اس سے پیشتر کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے تھے"

انگریزی [illegible] اصل عبارت انگریزی اخبار [illegible]

انگریزی عبارت مندرجہ اخبار السٹر وگراف متعلق وفات منشی میر اولاد علی صاحب

The Late Mir Aulad Ali

Dublin University has sustained a great loss by the death of Mir Aulad Ali, who held the Chair of Arabic and Hindustani for thirty-seven years, in immediate succession to Dr William Wright who was appointed to the Professorship of Arabic at Cambridge and to the post of keeper of the Syrian manuscripts in the British Museum. The Mir was a native of Lucknow, but was a master of the English Language and a powerful and attractive speaker at the various College Societies He was married to an English lady. His son is a distinguished physician. Not only was Professor Ali esteemed for his learning

and scholastic abilities, but in private life he was greatly beloved for his qualities of heart and head. To the family circle his loss is irreparable and many will feel in his death the loss of an ever ready sympathiser and benevolent friend The funeral was very largely attended.

(The Illustrograph, Dublin)

اس کے بعد دسویں اگست ۱۸۹۸ء کے پانیر میں یہ سانحۂ عظیم ان الفاظ میں شائع ہوا۔

"پندرھویں جولائی کو مسٹر اولاد علی پروفیسر عربی و اردو ڈبلن یونیورسٹی اپنے مکان نمبر ۱۲۹ لیسٹر روڈ ڈبلن میں اپنے بستر پر مردہ پائے گئے۔ پنجشنبہ کو بظاہر توانا و تندرست تھے اچھے خاصے بستر استراحت پر گئے تھے۔ ٹرنٹی کالج میں ۲۷ سال سے پروفیسر تھے اور ۱۸۶۱ء میں ڈاکٹر ولیم رائٹ کی جگہ مقرر ہوئے تھے جو بعد کو کیمبرج میں عربی کے پروفیسر اور سریانی زبان کی قلمی کتابوں کی حفاظت و نگرانی کی خدمت پر ممتاز ہوئے۔ مسٹر اولاد علی کالج میں بہت ہی ہردلعزیز تھے۔ خصوصاً ان لوگوں میں جو ان کی کلاس میں تعلیم پاکر انڈین سول سروس میں داخل ہوتے تھے۔ مرحوم لکھنؤ کے باشندے تھے۔ انگریزی زبان میں پوری مہارت رکھتے تھے کالج کی انجمنوں میں اکثر تقریریں کیا کرتے تھے۔ اُن کی بیوی مسز اولاد علی کے ساتھ جو برک شایر کی ایک خاتون ہیں بڑی ہمدردی کی جارہی ہے۔ ان کی وفات کے متعلق تحقیقات کی گئی تو طبی شہادتوں سے ثابت ہوا کہ موت کا باعث عارضۂ قلب تھا۔

انگریزی عبارت مندرجہ اخبار پانیر

Death of a Dublin Professor of Hindustani.

Mr. Aulad Ali, professor of Arabic and Hindustani

in Dublin University, was found dead in bed on July 15th at his residence 129 Leecester Road, Dublin. He had retired the previous night in apparently good health. The deceased had held his professorship in Trinity College for 37 years, having been appointed in 1861 in succession to Dr William Wright, afterwards professor of Arabic at Cambridge and keeper of the Syriac Mss in the British Museum. Mr Aulad was a great favourite in Trinity College, especially with all who passed through his class into the civil service of India. He was a Native of Lucknow. He was quite at Home in the English Languge and was a frequent speaker at the College Societies. Much sympathy is felt for Mrs Aulad Ali who is a Dertshire lady. An enquest was held, when the medical evidence showed that death was due to heart disease, and the jury returned a verdict accordingly.

(The Pioneer Allahabad, dated the 10th August, 1898. P. 5., Col. 3.)

راقم نے لکھنؤ جا کر اودھ اخبار کا فائل نکلوایا تو دیکھا کہ ماہ اگست ۱۸۹۸ء کے پرچہ میں منشی میر اولاد علی صاحب کی وفات کے متعلق پانیر کی انگریزی عبارت کا لفظی ترجمہ تحریر کر دیا ہے لہٰذا اُس مضمون کا مکرر لکھنا بے کار سمجھا گیا۔

گر یہ صرف ظاہری باعث موت تھا۔ اصلی باعث یہ ہوا کہ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر اعجاز اولاد علی

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شادی کرنے پر آمادہ ہوئے تو ایک لڑکی سے پینگ بڑھائے اور اُسے کوٹ کرنا شروع کیا۔ مگر بعد کو انھیں اور اُن کی والدہ کو اس لڑکی کی نسبت کچھ ایسے حالات معلوم ہوئے کہ اس کے ساتھ نباہ ہونا دشوار نظر آیا اور یقین ہو گیا کہ اگر اس کے ساتھ شادی ہو گی تو میں زندگی بھر کے لئے مصیبت میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ چنانچہ ماں سے مشورہ لینے کے بعد اس سے قطع تعلق کر کے ایک دوسری لڑکی سے عقد کرنا چاہا۔ اس پر اس پہلی لڑکی نے اپنی سوتیلی ماں اور باپ کی شرارت و ورغلانے سے وہاں کے مذاق کے مطابق ڈاکٹر سید ارشاد علی پر (بریچ آف ٹرمس) یعنی خلاف ورزی عہد کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمہ کے دائر ہونے سے منشی میر اولاد علی صاحب اور اُن کی بیوی نہایت پریشان ہوئیں اور ان افکار کا اُن کے دل و دماغ پر اس قدر اثر ہوا کہ اعضائے رئیسہ نے جواب دے دیا اور جاں بر نہ ہو سکے۔

سید صاحب کی وفات حسرت آیات کی یادگار میں دو قطعات تاریخ نکالے تھے۔ جو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس موقعہ پر درج کر دیئے جائیں۔

قطعہ تاریخ متعلق وفات میر صاحب

گلِ باغِ لیاقت سیّدِ عالی نسب جو تھے
سدھارے گلشن ایجاد سے تفریح جنت کو

خبر مرنے کی کیا تھی اک مصیبت کی کہانی تھی
اچانک موت سنتے ان کی بڑھایا رنج و حسرت کو

بحد یر آپ کے صد حیف علم و فضل روتے ہیں
ملایا خاک میں گردوں نے کیسے ذی لیاقت کو

جو اخلاق حمیدہ آپ کو بخشے تھے خالق نے
رہیں گے یاد ساری عمر وہ اہلِ محبت کو

نہ وہ فخر وطن ہی بلکہ فخرِ قوم تھے بے شک
کہاں پہونچا کوئی ہم چشم اس اعزاز و شہرت کو

جو آیا ہاتھ وہ دریا دلی سے خرچ کر ڈالا
تفاخر ذات سامی پر رہا دائم سخاوت کو

رہے اک عمر تک ڈبلن میں کالج کے پروفیسر
علوم مغربی میں ناز تھا اُن پر لیاقت کو

ادب کے ساتھ کرتے تھے انو آپ کے آگے
جو شاگرد آپ کے انگریز آتے تھے حکومت کو

ہمیشہ آپ یورپ میں رہے اسلام کے کوشاں
کہ فرضِ مذہبی سمجھے تھے تبلیغ شریعت کو
رہے برسوں تک اک رکن معزز بزم شاہی کے
بڑھا رکھا تھا ذاتی خوبیوں نے نام و عزت کو
نگاہِ لطف سے اک ذات کی خوشحال تھا کنبہ
قضا نے آ کے چھینا دفعۃً سب کی مسرت کو
ہوا افسوس یہ برباد گھر چھ سال کے اندر
رہا لڑکا نہ بیوی کوئی دیکھو اس مصیبت کو
جگر خوں کیوں نہ ہو اس بے وفا گردوں کی چالوں سے
کہ ڈبلن میں گیا لے جا کے پنہاں نیک طینت کو
خدای پاک اپنے فضل سے مرحوم کو بخشے
بنا دے مخزنِ انوار اُن کے کنج تربت کو

جو پوچھا اے مظفر حال رحلت میں نے ہاتف سے
صدا آئی گئے دیباچہ سید آج جنت کو

۱۸ ۶ ۹ ۸

قطعہ دوم

ز دنیا میر اولادِ علی رفت
بفردوس برین در سیر بادا
ز روئے التجا کلکِ مظفر
رقم زد خاتمہ بالخیر بادا
۹۸

میر اولاد علی صاحب کی دو مہریں تھیں ایک میں: اولاد علی سید مبخاری نقوی، اور دوسری میں (آلِ نبی اولاد علی) کندہ تھا۔

سیّد صاحب کی بیوی

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے ڈبلن میں ایک نیک خاتون سے عقد کر لیا تھا۔ ان بیوی کا برتاؤ ان کے ساتھ ایسا اچھا تھا کہ ان سے بہت ہی خوش تھے۔ جب ہندوستان میں رخصت پر تشریف لائے ہیں تو اکثر بسبیل تذکرہ اپنی میم صاحبہ کی لیاقت قابلیت اور نیک مزاجی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ وہ بہت ہی سلیقہ شعار اور غمگسار

بیوی ہیں۔ اُن کا خاندانی نام ریبپا صاحبہ تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد پورے ایک برس تک اُن کا سوگ مناتی رہیں اور جب کسی کو خط بھیجتیں تو اہل یورپ کے مذاق کے مطابق سیاہ حاشیہ کے کاغذوں پر کئی خط اپنے جیٹھ حکیم سید فرزند علی صاحب کو بھی اسی شان سے لکھے جن کے ساتھ کوئی تحفہ بھی ضرور بھیجا کرتیں۔ کبھی دستی پنکھا بھیجا۔ کبھی انگوٹھی کبھی ملکہ معظمہ کی تصویر۔ ان کے الفاظ سے لیاقت کے ساتھ سچی محبت بھی ٹپکتی تھی۔ ان کے جو خطوط حکیم صاحب موصوف اور مولوی سید علی صاحب کو آئے اُن میں سے اکثر میرے ہاتھ آئے اور میں نے ترجمہ کرا کے ان کو پڑھا۔ مولوی سیّد علی صاحب کے ایک خط کے ساتھ اُنھوں نے اپنے شوہر کی ایک انگریزی نظم بھیجی تھی جس میں بیوی کی سالگرہ کے موقع پر اُنھوں نے مسرت کا اظہار کیا۔

اس کے متعلق میم صاحبہ لکھتی ہیں میں ایک مضمون جو آپ کے لائق بھائی نے میری سال گرہ کے متعلق لکھا ہے بھیجتی ہوں جس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ملٹن جو ہمارے یہاں پُرانا اور نامور شاعر گزرا ہے اس کے کلام کا نمونہ ہے۔

راقم اس کا ترجمہ یہاں پر درج کرتا ہے۔

میرا دل ایک خوشی اور خوشگوار گرمی سے گرم جوشی پر ہے۔ نسیم سحر دل کو تازہ کر رہی ہے اور اُس کا چلنا عجب طریقہ سے تازگی بخش ہے۔ سورج کی نورانی کرنوں نے چمک کر تاریکی دور کر دی اور دنیا روشن ہو گئی۔ نیلگوں آسمان روشن ہے۔ شفق کی صفائی نہایت اعتدال کے ساتھ ہے۔ زمین کے ہرے بھرے پتوں پر جا بجا ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی شبنم کے قطرے اُن کی سبزی کے درمیان جگمگا رہے ہیں۔ خوشبودار پھول نسیم سحر کو معطر کر رہے ہیں۔ جو سانس لینے میں دل کے اندر پہونچکر رنج و تردّد کو دور بھگا دیتی ہے اور غمزدہ روح کو نہایت لطف و مسرّت بخشتی ہے۔ یہ معطر ہوا رنج و سستی کو دفع کر دیتی ہے۔ آج کے دن میں ایسا محظوظ و مسرور ہوں کہ میرے دل میں کوئی رنج و الم باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کا باعث نہ یہ موسم بہار ہے

نہ یہ کھلے ہوئے تازے پھول نہ ان چڑیوں کی چہچہانے اور گانے کی صدا جو اکثر رنج و اندوہ کے وقتوں میں ہمیں مسرت بخشتی رہتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں میرے دل کی شگفتہ کلی کو نہ کوئی راگ کھلا سکتا ہے نہ کوئی موسم بہار کا پھول یہ چیزیں ہر سال آتی ہیں اور اُن میں سے کوئی ایسی خوشی نہیں بخش سکتی جیسی کہ اس وقت حاصل ہے۔ یہ سال یہ مہینہ یہ دن میرے لئے تمام دوسرے وقتوں سے کیوں بڑھا ہوا ہے۔ میرے خیال کا طائر ایک شہباز کی طرح کیوں اس وقت بلند پروازیاں کر رہا ہے۔ جیسے راگ اس وقت سنے بہت کم سنے تھے۔ نہ کبھی ایسا تسلی بخش نغمہ سنا تھا نہ ایسے تال و سُر جب تک ملٹن کی ڈ پیراڈ ائیز لاسٹ) روئے زمین پر پائی جاتی ہے۔ نظر آئیں گے۔ میرے خیال کا طائر یہ جواب دیتا ہے کہ میں کسی ذاتی جوش میں اس قدر بلند پروازی نہیں کرتا ہوں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسے فرائض کو میں اپنے ذمہ نہیں لیتا۔ مگر جب میری محبوبہ مجھ سے ایک تحفہ کی خواستگار ہو تو اس کی خواہش پوری کرنے سے میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ ملٹن کے پسند کئے ہوئے پیمانہ (بحر و تقطیع) کو میں نے اپنی دلی خواہش سے نہیں پسند کیا بلکہ اصل یہ ہے کہ میری محبوبہ بیوی کے ستار کے لئے یہ ہی بحر زیادہ موزوں ہے۔ بیوی میں تمہاری تاریخ ولادت کے موقع پر یہ اشعار موزوں کرتا ہوں جن سے میرے دل کا جوش ظاہر ہوتا ہے اور التجا کرتا ہوں کہ میری محبت ہی کی شفاعت پر آپ اس کو منظور کریں گی۔ خدا کرے ہر آنے والی سالگرہ عمر و تندرستی میں اگلی سالگرہ سے بڑھی چڑھی ہو۔ اور آسمانی رحمت کے ساتھ میں دنیاوی مسرتیں ملتی رہیں۔ اے میری محبوبہ اے میری جان جب تم اس دنیا کو چھوڑو تو تمہاری پاک اور بے گناہ روح خداوند تعالےٰ کے سامنے پہونچ کر فرشتوں کی ہمنوں سے آواز ملا کر اُس بادشاہِ ابدی کی حمد و ثنا میں نغمہ سرا ہو۔

مسز اولاد علی نے شوہر کی وفات پر جو سوگوارانہ تحریر اپنے جیٹھ حکیم سید فرزند علی صاحب کو بھیجی تھی وہ اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ ان بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ کیسی سچی محبت

تھی۔ چنانچہ وہ خط بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

نقل خط مسز اولاد علی بنام حکیم صاحب

میرے پیارے بھائی!

اگرچہ آج تک آپ کی انگریزی بہن نے بذات خاص آپ کو کچھ نہیں لکھا۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ یہ تحریر ناگوار نہ ہوگی کیوں کہ یہ خط ایک نہایت غمگین حادثہ سے یعنی آپ کے پیارے بھائی کی موت کے متعلق ہے لکھتی ہوں۔ میں دفعۃً بے وارث اور تنہا ہو گئی۔ اب مجھ کو جو رنج اس واقعہ سے ہوا اس کا اظہار غیر ممکن ہے۔ آپ کے پیارے بھائی کی موت اور اُس کی وحشت ناک خبر سے میرے پیارے لڑکے نے آپ کو مطلع کیا ہے۔ میں اس وقت اسی پیارے بیٹے کے ساتھ لندن میں تھی اور بہت بیمار تھی وہیں تار کے ذریعہ یہ اندوہناک خبر پہونچی۔ میرے بیٹے نے اس قیامت خیز واقعہ کے بیان کرنے میں اندیشہ سمجھا۔ تمام رات قریب چار سو میل سفر کے طے کرنے میں مجھ کو کچھ نہیں معلوم ہوا۔ اُس نے مجھ سے صرف یہی کہا کہ والد بہت بیمار ہیں۔ جب میں اپنے گھر پہونچی تو اس وقت کی غمناک حالت میں ہرگز بیان نہیں کر سکتی۔ اُس کیفیت کا اظہار بالکل غیر ممکن ہے۔ میں اُس وقت سے اس حادثہ کی وجہ سے بیمار ہوں۔ آپ کے پیارے بھائی ایسے فیاض تھے کہ انھوں نے آئندہ کے واسطے کچھ پس انداز نہیں کیا۔ میرے بیٹے نے ایک لڑکی کو نیک سمجھ کر شادی کا پیغام دیا تھا لیکن بعد ازاں اُس کو معلوم ہوا کہ وہ نہایت بد مزاج ہے۔ اس پر اس کے لائق باپ نے اس کو شادی کی رائے نہیں دی لڑکی کے خاندان کے لوگوں نے برہم ہو کر عدالت میں دعوے دائر کر دیا۔ آپ کے بھائی کو اس جھگڑے سے اس قدر اندوہ ہوا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب میں اس مصیبت میں گرفتار ہوئی اگر کوئی شخص اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے واسطے انگلستان بھیجنا چاہے تو تربیت کے لئے میرے پاس بھیج دے۔ اکثر امراض میں مبتلا رہتی ہوں۔

میں خیال کرتی ہوں کہ رنج اور علالت نے مجھ پر برا اثر کیا ہے۔ ۱۲ ستمبر تک میں اپنے سعادتمند بیٹے کے پاس لندن جانے والی ہوں۔ وہاں ایک ماہ قیام کروں گی۔ میں نے آپ کا خط اپنے لڑکے کے پاس بھیج دیا ہے وہ آپ کے خط کا جواب ضرور لکھے گا۔ وہ نہایت لائق فرزند ہے۔ مجھے ہر بات میں مدد دیتا ہے۔ اچھا ہوا کہ میرا سعید لڑکا اُس سخت زنجیر کی کڑیوں کے پھندے سے جس کو وہ کبھی توڑ نہ سکتا تھا اور باوجود اس صرف کثیر کے ایسی نامعقول بی بی سے پریشان اور تمام عمر مصیبت میں مبتلا رہتا۔ بچ گیا۔ مجھ پر اور اُس پر ایک سخت بلا نازل ہو جاتی اور اس کی وجہ سے میرے اور اُس کے درمیان جدائی ہو جاتی۔ خوش قسمتی سے وہ عورت ڈبلن میں رہتی تھی۔ مجھے اس کے حالات سے آگاہی ہوگئی اور خدا کا شکر ہے کہ سب سے پیشتر میرا لڑکا بھی ان تمام حالات سے واقف ہوگیا۔ اب جوار شاد علی نے ایک بی بی پسند کی اور اُس کے ساتھ شادی ہوئی وہ بہت نیک بخت لائق بیوی ہے۔ میں اس لڑکی کو جب سے جانتی ہوں کہ وہ کم سن تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ وہ نہایت وفادار بی بی ہوگی۔ ڈاکٹر کی بیوی کے واسطے یہ بات ضروری ہے کہ وہ اُس کے واسطے اچھی مددگار ہو۔ میں خدا کے اس احسان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی کہ وہ مقدمہ ۲۵۰ پونڈ کے ادا کرنے پر طے ہوگیا اور اس کے علاوہ وکلاء و بیرسٹروں کی فیس و پیروی مقدمہ میں بہت کچھ خرچ ہوا۔ علالت کی وجہ سے مجھے ایک یہ بھی بڑی تکلیف ہے کہ اخبار نہیں دیکھ سکتی۔ میرے عزیز بھائی مجھے ضرور اس امر کا خیال ہے کہ ہم روحانی طور پر ضرور تمھارے پاس ہیں۔ جیسا کہ آپ کا خیال ہماری طرف ہے۔ بے شک میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں جس کا ثبوت آپ کی ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ اور اسی سبب سے ہم لوگ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ درحقیقت مجھ کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں سب کو دیکھ رہی ہوں اور مشرقی زندگی کے خیال سے میں آپ سے بہت نزدیک ہوں محبت قدرتی بخشش ہے۔ یہ لطف خدا کی جانب سے ملتا ہے۔ بناوٹ سے حاصل نہیں ہوتا۔ واقعی بلا محبت کے دنیا کی زندگی ہیچ اور اس کی

بیمار ویران معلوم ہوتی ہے۔ اپنے یہاں کی عورتوں سے اس انگریزی رشتہ دار کی محبت ظاہر کیجئے اور سب چھوٹے بڑوں کو درجہ بدرجہ سلام کہئے۔ جو لوگ آپ کے خاندان میں ہیں اُن سب کی خوشی اور خیریت کی خواہاں آپ کی بہن کی ٹی اولاد علی

یکم ستمبر ۱۸۹۸ء نمبر ۱۲۹ لینٹر روڈ ڈبلن

ڈاکٹر ارشاد علی نے خود اپنی والدہ کی علالت کے متعلق حکیم صاحب کو لکھا ہے کہ میری والدہ [illegible] ایک عارضہ سے نجات ملتی ہے کہ دوسرے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ابھی حال میں اُن کا پھیپھڑا بہت خراب ہو گیا ہے۔ باسباب ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئرلینڈ کی آب و ہوا نہایت مرطوب ہے اور ان کے مزاج کے موافق نہیں لیکن وہ اپنا وطن چھوڑنا پسند نہیں کرتیں۔ ڈبلن میں اُن کے بہت ملنے والے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں اُن سے وہ بہت محبت رکھتی ہیں اور سلوک سے پیش آتی ہیں۔ میرے محبوب چچا یہ سال ہم لوگوں پر نہایت رنج وغم کے ساتھ گزرا۔ میں شادی کے مقدمہ میں ماخوذ ہوا چاہتا تھا۔ بلا وجہ کو ہزارہا روپیہ خرچ پڑا اور بلا کسی قصور کے بڑا بار مجھے اُٹھانا پڑا۔ میں اخیر ہفتہ کے دن مقدمہ کے تصفیہ اور اپنی والدہ کے علاج میں مشورہ دینے کے واسطے لندن سے ڈبلن آیا اور آئندہ ہفتہ میں واپس چلا جاؤں گا۔ اس عرصہ میں مجھے بہت کام اور اپنے وکلاء سے خط و کتابت کرنا پڑی۔ جواب ختم ہو گئی۔ یہ بے توجہی کثرتِ کام کی وجہ سے رہی جس کا مجھے سخت صدمہ ہے۔ اب فرصت ہو گئی ہمیشہ آپ کو وقت پر چٹھیاں بھیجا کرونگا۔ مجھ کو اس خیال سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے رشتہ دار اس قدر دور دراز فاصلہ پر ہیں جنھوں نے اگرچہ مجھے کبھی نہیں دیکھا تاہم مجھ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اگرچہ فی الحال میں کسی بات کا مستحق نہیں ہوں لیکن آئندہ کوشش کروں گا کہ آپ کی مہربانیوں کا مستحق ہوں۔ آپ لوگوں کی عنایتیں مجھ پر اور میری والدہ پر شامل ہوئی ہیں۔ میری اہلِ خانہ آپ کی خدمت میں آداب فدویانہ عرض کرتی ہے۔

مسز اولاد علی کی رحلت

بیگم صاحبہ کو اپنے فخر روزگار شوہر کی وفات سے سخت صدمہ پہونچا۔ سید صاحب کی زندگی میں وہ اعلیٰ طبقہ علما و شرفا میں داخل تھیں۔ شوہر کے علم و فضل مرجعیت عامہ کی وجہ سے تمام معزز لوگوں کی ان کے یہاں آمد و رفت رہتی تھی اور رات دن علم و فضل کا چرچا تھا۔ شوہر کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ سب باتیں جاتی رہیں۔ اور سوا ایک ہونہار بیٹے کے اور کوئی ہمدرد نہیں باقی تھا۔ چنانچہ جب تک زندہ رہیں فاضل شوہر کے فراق کا صدمہ کسی وقت دل سے دور نہ ہوتا تھا۔ تین چار برس اسی صدمہ میں مبتلا رہیں تو مصائب نے تندرستی خراب کر دی اور اکثر بیماری کی شکایت رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ہمدرد سعادتمند فرزند ارشاد علی کو جنون ہو گیا اور اس سانحۂ ہوش ربا سے ایسا روحانی صدمہ پہونچا کہ جانبر نہ ہو سکیں اور ۸ فروری ۱۹۰۴ء کو شوہر کے مرنے کے پانچ چھ برس بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ سید صاحب کے یورپین خاندان کے صادق الوداد دوست ڈبلو مور صاحب نے اس سانحہ کی اطلاع فوراً مولوی سید علی صاحب کو کی اور اس خط کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

جناب من۔ میں اولاد علی صاحب اور اُن کی بیوی کا ایک قدیم دوست ہوں۔ اور ان تعلقات کی بنا پر آپ کو میر اولاد علی صاحب کی بیوی کی ناگہانی اور حسرت ناک موت کی خبر دیتا ہوں۔ اُن کا انتقال آٹھویں فروری روز شنبہ ۱۹۰۴ء کو ڈبلن میں جہاں وہ سکونت پذیر تھیں ہوا۔ وہ اگرچہ ایسی توانا نہ تھیں مگر دفعتہً انتقال کر جانے کا خیال بھی کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔ ساتویں فروری کو بہت اچھی حالت میں تھیں مگر ہفتہ کی صبح کو دیکھا تو اپنے بستر پر نہایت خاموشی کے ساتھ آخری نیند لے رہی تھیں اور بچھونے پر بے جان پڑی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا انتقال بغیر کسی تکلیف کے ہوا۔ ان کے مرض کے متعلق ڈاکٹر نے یہ تشخیص کیا کہ قلب کی بیماری اور لقوے کا ایک خفیف دورہ باعث ہلاکت ہوا۔ آپ اندازہ کر سکتے

ہیں کہ ان کے اکلوتے فرزند ڈاکٹر ارتھر اولاد علی یعنی ارشاد علی کی اس سانحہ سے کیا حالت ہوئی ہو گی۔ وہ بھی اک دماغی مرض میں مبتلا ہیں جس سے صحت ہونا بہت مشکل ہے۔ ان کے اسی مرض نے بھی دو سال سے ماں کو بدحواس کر رکھا تھا اور یہی صدمہ تھا جس کی وجہ سے ان کا خاتمہ جلدی ہو گیا۔ اطلاع کے لئے صرف یہی خط ان کے شوہر کے رشتہ داروں کو بھیجا جاتا ہے اور اس میں بھی بڑی دشواری پیش آئی۔ یہ پتہ بہت مشکل سے معلوم ہوا۔ کیوں کہ شوہر کے بہت سے خطوط وکاغذات ارشاد علی کی والدہ نے تلف کر ڈالے تھے۔ لہٰذا میر اولاد علی صاحب کے تمام رشتہ داروں کو آپ اس وحشت ناک واقعہ کی اطلاع کر دیجئے۔

آپ کا سچا دوست ڈبلو مور ۱۲ فروری سنہ ۱۹۰۴ء

از لندن ہمپ سنٹ ڈائنیگ روڈ نمبر ۱۶

خاکسار نے مرحومہ کی وفات کی یادگار میں بھی ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔

جو ذی ہنر تھی نہایت عقیل نیک سرشت	گئی وہ خلد بریں کو جہانِ فانی سے
وہ دیکھنا ہوئی مریم صفات حورِ بہشت	جو فکرِ سال مظفر تھی بولا یہ ہاتف

سید اولاد علی صاحب کے فرزند ڈاکٹر سید ارشاد علی بی اے ایم بی سی ایچ بی اے او یونیورسٹی ڈبلن

ڈاکٹر سید ارشاد علی ماں باپ کے اکلوتے اور لاڈلے فرزند تھے۔ باپ نے ارشاد علی نام رکھا تو ماں نے اپنے ملک کے رواج کے مطابق ارتھر نام قرار دیا۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسی خوبی سے ہوئی کہ لائق و ہونہار فرزند ثابت ہوئے۔ صورت میں نہایت خوش رو جوان اور سیرت میں نہایت نیک نفس و پاک طینت واقع ہوئے تھے۔ باپ کی ذہانت وطباعی بھی ورثہ میں پائی تھی۔ چنانچہ تحصیل علم میں بڑی پامردی و جفاکشی سے کام لیا۔ پہلے

بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر فن ڈاکٹری میں سول سرجنی کا امتحان پاس کیا۔

طبی تکمیل کے بعد پہلے پہل خاص اپنے وطن ڈبلن کے شفاخانے میں ڈاکٹر مقرر ہوئے اور تقرر کے ساتھ ہی انھوں نے ایسی محنت و حذاقت کے ساتھ کام شروع کر دیا کہ بہت سے مریض ان کے ہاتھ سے اچھے ہوئے اور لوگوں میں شہرت ہو گئی۔ چنانچہ ملک معظمہ کوین وکٹوریہ کے خاص معالج شاہی شفاخانے کے ڈاکٹر اعظم سر جارج ایچ پورٹر بارنٹ صاحب اپنے سارٹیفکٹ میں لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر آرتھر اولاد علی نے ڈاکٹری علم کی تحصیل و جراحی بیتھ اسپتال میں کی۔ یہاں وہ میری نگرانی میں رہے۔ ہمیشہ سرگرمی اور توجہ سے کام کیا۔ ان کا چال چلن اچھا ہے اور طبیعت میں نہایت استقلال ہے۔ رزیڈنٹ پیوپل یعنی (مقامی شاگردی) کے کام کو میرے اطمینان کے موافق انجام دیا۔ اب چوں کہ انھوں نے پیشہ طبابت کے واسطے پوری قابلیت حاصل کر لی ہے۔ لہذا تہ دل سے میں ان کی سفارش کرتا ہوں۔" ۴ ر دسمبر ۱۸۹۰ء

اس کے چار پانچ روز ہی بعد ڈبلن ہسپتال کے سول سرجن جیمس ٹل صاحب نے جو شاہی طبی کالج کے پریسیڈنٹ تھے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے کہ

"ڈاکٹر ارتھر اولاد علی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب کہ اُنھوں نے ڈاکٹری علم کی تحصیل شروع کی تھی وہ ہمیشہ سے مستقل مزاج اور جفاکش ہیں اخلاق شریفانہ ہیں اور اپنے فن میں بہت اچھی عملی اور علمی قابلیت حاصل کر لی ہے۔ میرے ہسپتال کے بہت مریضوں کا انھوں نے علاج کیا جو میرے لئے نہایت ہی قابل اطمینان تھا۔"

ڈاکٹر کنڈال فرنکس ممبر کونسل شاہی کالج اسی زمانہ میں لکھتے ہیں کہ

"میں ڈاکٹر ارشاد علی کو مدت سے جانتا ہوں اور اکثر موقعوں پر اُنھوں نے میرے ساتھ کام کیا اور مجھے بار ہا ان کے جانچنے کا اتفاق ہوا۔ ان کو طبی اصول میں پوری مداخلت ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ہمیشہ ان کو خلیق معزز اور شریفانہ انداز پر دیکھا۔"

ڈاکٹر ولیم جی ہیپ برن صاحب اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"ڈاکٹر ارشاد علی کو جو قابلیت ڈاکٹری میں حاصل ہے اس کو میں مدت سے جانتا ہوں۔ وہ سرجیکل رزیڈنٹ کا کام بھی کر چکے ہیں۔ ان کی علمی قابلیت اور عملی کارگزاری کا مجھے بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ ان کی قابلیت و ذکاوت اپنے پیشہ میں انھیں بہت کامیاب کریگی اور ان کا شریفانہ چال چلن ان کے عہدے کے حق میں نہایت فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ اب انھوں نے ارٹس میڈیسن سرجری کی ڈگری بھی حاصل کرلی ہے"

ڈاکٹر ولیم اسٹوکس پروفیسر سرجری رایل کالج ممتحن سرجری یونیورسٹی کیمبرج کالج رقمطراز ہیں کہ

"ارتھر اولاد علی زمانہ تعلیم میں بھی جفاکشی و سرگرمی میں مشہور تھے۔ اپنے عہدے کا کام انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اور جواب دہی کی ذمہ داریوں کا لحاظ کرکے انجام دیا ہے۔ یہ نہایت ذی ہوش و ذکی ڈاکٹر ہوں گے۔"

ڈاکٹر فلپ کرامٹن اسمیلی صاحب سرجن ہسپتال طفلان متعلقہ امراض حلق وگوش لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر ارتھر اولاد علی نہایت فہیم و لائق ڈاکٹر ہیں۔"

ڈاکٹر فرزین صاحب ٹی ہیوسٹن فیلو ممبر کونسل سرجن شاہی کالج لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر ارتھر اولاد علی کو میں اس زمانہ سے جانتا ہوں جب کہ یہ لیڈ ہاسپٹل میں طالب علم تھے یہ نہایت سمجھ کر محنت سے کام انجام دیتے تھے۔ جس زمانہ میں انھوں نے ڈگریاں حاصل کی ہیں اسی زمانہ میں انھیں اپنے پیشہ کے علمی و عملی اصول معلوم ہو چکے تھے۔ جو عملی تجربہ انھیں انگلینڈ میں حاصل ہوا جب کہ وہاں اسسٹنٹ کے عہدہ پر مقرر تھے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ یہ فن کو زیادہ شہرت دیں گے۔"

ایک دوسرے ڈاکٹر ہینسپل فیلو طبی شاہی ممبر سوسائٹی لندن لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر ارتھر اولاد علی نے ڈاکٹری فن کے ہر شعبہ کو نہایت سرگرمی و توجہ سے حاصل کیا اور رزیڈنٹ سرجیکل پیوپل کی اعلیٰ خدمت پر مقرر رہے اور وہاں بہ غریبوں کے حال پر

نہایت مہربان رہتے تھے اور اُن کا دھیان بہت توجہ سے کرتے تھے۔ عہد طالب علمی میں ان کے شریفانہ طرز عمل اور استقلال کو دیکھ کر ان کے اساتذہ بھی ان کے حال پر نہایت مہربان رہتے تھے انھوں نے پوری لیاقت حاصل کی ہے اور نہایت لائق و کارگزار ڈاکٹر ثابت ہونگے۔"

ڈاکٹر راؤدن مسٹر میکن ماررا لکھتے ہیں کہ

" یہ نہایت لائق ڈاکٹر ہیں اور مجھے ان کی سفارش کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں۔"

ڈاکٹر ایچ آر سوئیری صاحب ممتحن سرجری رائل یونیورسٹی آئرلینڈ لکھتے ہیں کہ

" میں ڈاکٹر ارشاد علی کی لیاقت و محنت کی داد دیتا ہوں۔ اُن کو بڑا قابل اور تعلیم یافتہ جانتا ہوں۔ یہاں اُنھوں نے امراض گوش و چشم کے علاج بڑی قابلیت سے کئے۔"

ڈاکٹر سیاموئل آر ماسن ممبر مجلس ممتحنان شاہی جراح لکھتے ہیں کہ

"عورتوں کے امراض میں اُنھوں نے بہت اچھا تجربہ حاصل کیا ہے اور نہایت لائق و ہوشیار ڈاکٹر ہیں۔"

ڈاکٹر نکولس سی ریٹ لکھتے ہیں کہ

" میں ان کے زمانہ شاگردی سے تکمیل فن کے عہد تک ان کے کام کو دیکھتا رہا اُنھوں نے علم کے صحیح راستہ کو طے کیا ہے اور ان میں وہ قابلیتیں موجود ہیں جو جہاں ہونگی اپنے پیشہ میں شہرت و کامیابی پائیں گی۔"

اس قسم کے پندرہ سارٹیفکٹ مطبوعہ ہیں جن کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے بطور اختصار کے مضامین یہاں پر لکھے گئے ہیں۔ ان تمام سندوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ارشاد علی کس لیاقت و حذاقت کے ڈاکٹر تھے۔ کیسے خوش اخلاق خدا ترس اور مریضوں کے حال پر مہربان تھے اور جس مقام پر رہے وہاں انھوں نے کیسی لیاقت و ہر دل عزیزی حاصل کر لی تھی۔

انسان کی خوبیوں کا سب سے زیادہ قیمتی پھل اس کے والدین کی رضامندی ہے

یہ نعمت بھی انھیں حاصل تھی۔ چنانچہ ان کی والدہ نے یکم دسمبر ۱۸۹۰ء کو جو خط اپنے جیٹھ حکیم سید فرزند علی صاحب کو لکھا تھا اُس میں تحریر فرماتی ہیں کہ ارشاد علی آج کل پارلیمنٹ ہوس سے پانچ میل کی مسافت پر لندن میں کام کر رہا ہے۔ وہاں اس کی ڈاکٹری کی بڑی قدر ہو رہی ہے۔ اس شفاخانہ کی بہت معمولی حالت ہو رہی تھی اُس نے جاتے ہی اپنی حذاقت و محنت سے اس کو رونق دیدی اور لوگ رجوع ہو گئے۔ سب لوگ اس کے طرزِ عمل سے رضامند ہیں۔ وہ دن رات نہایت مستعدی و جفاکشی سے کام کرتا ہے۔ نہایت رسا اور ہر دلعزیز ہے اور مریضوں کے علاج میں بہت کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

ڈاکٹر ارشاد علی سول سرجن کے ممتاز عہدے پر برسوں ملازم رہے اور متعدد شفاخانوں میں نیک نامی سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ علمی قابلیت کے ساتھ وہ ذہین اور خلیق بہت تھے۔

خود ڈاکٹر ارشاد علی نے اپنے بڑے چچا کو ایک خط میں لکھا ہے کہ میرا مطب بفضلہ بہت اچھی طرح ترقی کر رہا ہے۔ دن رات سرگرمی سے کام کر رہا ہوں۔ میرے پاس تین چار بجے بے وقت مریض بھی آتے ہیں اگرچہ اُس وقت بستر سے اٹھنا تکلیف دہ ہوتا ہے مگر علاج میں کمی نہیں کرتا۔ آپ کے حالات و معالجات جو مریضوں کے تجربہ کے متعلق ہوں اُن کے سننے کا میں بہت مشتاق و منتظر ہوں۔ میں ایک غریب علاقہ میں کام کر رہا ہوں اور آپ کی طرح میں بہت سے غریبوں کا علاج بلا اجرت کر دیا کرتا ہوں میں دولتمندی کے مقابلہ میں ہر دلعزیزی و وقعت کو زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔

مگر ان سب مسرتوں اور ترقیوں کو ان کی شادی کے واقعہ نے خاک میں ملا دیا۔ پہلی منسوبہ کو چھوڑ کر دوسری کے ساتھ عقد کرنے میں اُن کو مسرت تو حاصل ہو گئی اور ایسی ہمدرد ملی جو درد و غم اور زندگی کی دشواریوں میں ان کی مونس و غمگسار رہا کرتی اور وہ اس سے بے انتہا خوش تھے مگر پہلے غلط انتخاب کے انجام میں علاوہ مصارف مقدمہ کے دو سو پچاس پونڈ کا یعنی

(تین ہزار سات سو پچاس روپیہ) تاوان ادا کرنا پڑا۔ اور اس جھگڑے سے جو پریشانی اُٹھانا پڑی طبیعت افسردہ ہوگئی۔ اور سب سے بڑا صدمہ ان ماں بیٹے کے دلوں کو سید اولاد علی صاحب کی ناگہانی وفات کا تھا جو اسی جانکاہ معاملہ سے پیش آیا تھا۔ ہر وقت تکلیف دیتا تھا۔ یہ رقم ڈاکٹر صاحب اپنی آمدنی سے نہیں ادا کر سکے بلکہ اولاد علی صاحب کی رقم (لائف انشورنس) یعنی بیمۂ زندگی کی مد سے والد کی وفات کے بعد ادا کی گئی اور پھر اس بار کو اس چیز نے اور روز افزوں کر دیا کہ پدر بزرگوار انھیں خانگی دشواریوں کی وجہ سے ایک معتد بہ رقم ایک سو ساٹھ پونڈ کا قرضہ[1] چھوڑ گئے تھے جن کو ڈاکٹر صاحب اور اُن کی والدہ نے باپ کے متروکہ سے ادا کیا۔ اخراجات کثیر کا اثر بھی ان کے اور ان کی والدہ دونوں کے لئے نہایت دل شکن تھا۔ ان مصیبتوں کا اثر یہ ہوا کہ چند ہی روز میں ڈاکٹر صاحب کے سر سے ماں کا سایۂ عاطفت بھی اُٹھ گیا اور اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر کہ وہ اپنے لائق شوہر کے فراق میں گھل گھل کر ملول ہوگئی تھیں اُن کی وفات سے پیشتر ان کی حالت مجنونوں کیسی ہوگئی۔ اور اسی حالتِ جنوں میں تھوڑے زمانہ کے بعد غالباً وہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ جن کا حال مسٹر ڈبلو مور ایک لائق بزرگ نے لندن سے مولوی سیّد علی صاحب کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔ اب ارشاد علی کی غمزدہ حالت قابل افسوس ہے کہ ان کو دماغی مرض ہوگیا ہے جس سے ان کی جاں بری دشوار ہے جس کا ضمناً ذکر

---

[1] اس قرضہ کے متعلق خود میر اولاد علی صاحب نے اپنے اعزہ کو خط و کتابت میں تحریر کیا تھا چنانچہ وہ ایک خط مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۸۶۹ء میں اپنے منجھلے بھائی حکیم سیّد فرزند علی صاحب کو لکھتے ہیں کہ ابھی قرضہ تعلیم ارشاد علی کچھ تھوڑا ہے بہ نسبت سابق۔ کہ باقی ہے وہ بھی انشاءاللہ تھوڑے عرصہ میں یعنی ایک دو سال میں ادا ہو جائیگا ہر سال میں زیادہ پانچ چھ ہزار روپیہ سے ادائی قرضہ غیر ممکن تھا۔ کبھی کبھی تو فقط تین چار ہزار روپیہ سے زیادہ نہ ادا کر سکا۔ اہالیان بنک کچھ پر کبھی تنگی نہیں کرتے۔ اور جس قدر میں دیتا ہوں لے لیتے ہیں۔ یہ مقام شکر الٰہی ہے ورنہ کچھ بھی نہ ہو سکتا۔ اب میں قریب ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے تین چار ملہ برابر ہر مہینہ میں ولایت مارہ ... سے بھیجتا رہوں گا۔

مسٹر اولاد علی کی رحلت میں آچکا ہے۔ مولوی سید علی صاحب کو اب اس کی جستجو تھی کہ ارشاد علی کی کیا حالت ہے اور کسی سے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ آخر انھوں نے لکھنؤ کے سپرنٹنڈنٹ جیل ہوم صاحب کے نام ایک خط جو یہاں سے وظیفہ یاب ہو کر لندن واپس چلے گئے تھے لکھا اس کا جواب یہ ملا کہ مولوی رمضان علی عرف مولوی سید علی کو ان کے خط کے جواب میں تحریر کیا جاتا ہے کہ آپ کی تحریر کے بموجب میں نے حتی الامکان لندن میں ڈاکٹر ارشاد علی کی تلاش کرائی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسا آپ کا خیال ہے کہ وہ شاید اب دنیا میں موجود نہیں ہے اس لئے کہ دماغی بیماری کی وجہ سے اپنی زندگی سے یاس تھی اور اس کا زیادہ زندہ رہنا غیر ممکن تھا۔ جون ۱۹۰۷ء

مگر افسوس کہ ان کی صحیح وفات معلوم نہ ہوسکی۔ راقم بھی دریافت حال کی طرف پوری توجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء کو میں نے ڈبلن کالج کے پرنسپل کے نام ایک خط لکھ کر دریافت کیا تھا کہ میر اولاد علی صاحب کی بیوہ اور ان کے خاندان کا حال دریافت کر کے بتائیں مگر جواب میں بالکل مایوسی ہوئی ۱۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو آئی ایچ برنارڈ صاحب پرنسپل ڈبلن کالج نے اس کے جواب میں راقم کے نام جو خط بھیجا اُس کے مضمون کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ

”میر اولاد علی کے انتقال کو پچیس سال ہو چکے اور ایسا کوئی شخص نہیں ملتا جس سے اُن کے خاندان کے کچھ بھی حالات معلوم ہوسکیں اور مجھے افسوس ہے کہ آپ کے جملہ سوالات سے کسی سوال کا جواب بھی ناواقفیت کی وجہ سے نہیں دے سکتا“

چند ماہ ہوئے کہ حاجی سید سجاد حسین صاحب نے بیان کیا کہ مولوی محمد علی صاحب صدر انجمن خلافت نے رنگون میں مجھ سے میر اولاد علی صاحب کے متعلق تذکرہ کیا تھا یہ سن کر احقر نے ان کے نام دفتر خلافت دہلی کے پتہ سے ایک خط لکھا اور اس کے بعد جب وہ لکھنؤ میں آئے تو خود جا کر محل سرائے فرنگی محل میں اُن سے ملا اور پس ماندگان میر اولاد علی صاحب کے بابت پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ کئی سال ہوئے جب میں لندن گیا تو وہاں میر اولاد علی صاحب

کی بعض تصنیف بھی دیکھی اور ان کا ذکر بھی آیا مگر اُن کے پوتے اور بہو سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ اُن کی بابت کسی سے دریافت کیا اور میرا ڈبلن جانا نہیں ہوا۔ اور جب یہ سُنا کہ مسٹر اسٹورٹ ڈپٹی کمشنر ہردوئی آئرلینڈ کے باشندے ہیں تو اُن سے بھی راقم نے ورثائے میر اولاد علی صاحب کے متعلق دریافت کیا مگر انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اب بھی تحقیق حال کی بابت سلسلہ جاری ہے۔
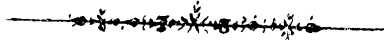
تقریظ از نثار مشہور روزنگار جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات صوبہ اورنگ آباد دکن سکرٹری انجمن ترقی اردو

مولوی مظفر حسین صاحب سلیمانی نے جو کئی کتابوں کے مولف ہیں حال ہی میں ہندوستان کے ایک فاضل اور اپنے ہم وطن پروفیسر سید اولاد علی مرحوم کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے۔

سید صاحب موصوف سلطنت اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے بھائی صاحب عالم مرزا محمد جواد علی بہادر عرف جرنیل صاحب کے اُستاد، مشیر اور دوست تھے۔

انتزاع سلطنت کے بعد جب بادشاہ کی والدہ، ولی عہد بہادر اور جرنیل صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اپنے حقوق کی پیروی کے لئے انگلستان گئے تو سید صاحب بھی ان کے ہمراہ گئے بادشاہ کی والدہ اور بھائی کا وہیں انتقال ہوگیا اور جب یہ لٹا قافلہ اپنے وطن کو واپس آگیا تو سید صاحب وہیں رہ گئے۔ چند روز کے بعد وہ ڈبلن یونیورسٹی میں عربی اور بعض ہندوستانی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ بوجہ علم و فضل ان کی وہاں بہت عزت و وقعت تھی۔ ۲۰ سال تک مدت پروفیسری پر مامور رہے۔ وہیں شادی کی اور اُس سے ایک بیٹا بھی ہوا جو ڈاکٹر تھا۔ آخر ۱۸۹۸ء میں انتقال کرگئے۔

میں نے اس کتاب کے مسودہ کو شروع سے آخر تک پڑھا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ مولوی مظفر حسین صاحب نے ہندوستان کے ایک فاضل کے حالات جسے ہم بھول گئے تھے بڑی تحقیق اور زمان کاہی سے جمع کئے ہیں۔ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اس زمانہ کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور خاصکر اس بات کے معلوم ہونے سے خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے ایک

شخص نے محض اپنے علم و فضل سے ایک غیر ملک میں کیسی ہر دل عزیزی اور عزت حاصل کی۔ قابل مولف کا یہ کام بہت قابل شکریہ ہے اور مجھے امید ہے کہ اہل ملک اس کی قدر فرمائیں گے۔

عبدالحق ۹ نومبر ۱۹۲۷ء
اورنگ آباد دکن

تقریظ از جناب مولوی محمد امین صاحب مارہروی مہتمم تاریخ ریاست بھوپال مصنف نعت پیمبر مکاتیب نواب محسن الملک و وقار الملک و بیگمات بھوپال

مخدومی منشی مظفر حسین صاحب سلیمانی حقیقۃً قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے ایک ایسے ہم وطن کی سوانح حیات کو قلمبند کیا ہے۔ جس کی زندگی غریب مگر باہمت نوجوان کے لئے قابل نمونہ ہے۔ حقیقت میں ایسے ہی اشخاص جو اپنی قابلیت ذہانت اور ذکاوت سے مناصب اعلیٰ پر فائز ہوتے ہیں اور اپنی کوشش و سعی سے مراتب اعلیٰ حاصل کرتے ہیں ایسے ہی قابل تذکرہ ہوتے ہیں۔ پروفیسر اولاد علی صاحب نے ہندوستانی گھروں کے دالانوں میں چٹائی پر تربیت حاصل کی۔ اپنی قابلیت سے واجد علی شاہی دربار میں رسوخ حاصل کیا۔ انتزاع سلطنت اودھ کی چارہ جوئی کے سلسلہ میں اراکین سلطنت کے ساتھ انگلستان گئے۔ راستہ میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی اور اپنی ذہانت و ذکاوت سے انگلستان پہونچتے پہونچتے پوری استعداد حاصل کرلی اپنے آقاؤں کے ساتھ پوری وفاداری سے کام کیا اور جب ایک آخری نتیجہ پر پہونچ گئے تو لندن ہی میں سکونت اختیار کرلی۔ گزر اوقات کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں عربی فارسی اردو کی پروفیسری اختیار کی۔ خداوند کریم نے ان کو فارغ البالی

طا کی اور اپنی زندگی کو نہایت کامیابی کے ساتھ ختم کیا ایک ایسا شخص حقیقۃً ہماری قوم کے
جوانوں کے لئے نمونہ ہے سلیمانی صاحب کے نظرِ انتخاب کی داد ناظرین کو دینی چاہیئے
ں انتخاب میں مؤلف سوانح کا یہ خاص جذبہ بہت زیادہ قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے اپنے
ن ہی کے ایک فرد فرید کو اپنے تذکرہ کے لئے چن لیا ہے جس سے ان کو کوئی منفعت کی توقع
ہے۔ اور نہ کسی قسم کے منافع کی امید ہو سکتی ہے صاحبِ تذکرہ کی اولاد بھی نہیں ہے جن سے شکریہ
کے چند الفاظ ہی سے مؤلف کا دل خوش ہو سکے اور حقیقتاً ایسے ہی صاحب محبِ وطن
کے خطاب کے لائق ہوتے ہیں۔

محمد امین ایڈیٹر ظل السلطان
شاہجہان آباد بھوپال ۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء

تقریظ از جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار کلکٹر دہلوی ایم آر اے ایس لندن مصنف تاریخ بیجاپور تاریخ مملکت دہلی حسن معاشرت کایاتِ لطیفہ لطائف عجیبہ خلف الرشید شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صاحب مصنف مراۃ العروس توبۃ النصوح وغیرہ

تیر انداز بیاں شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

میں نے نامۂ مظفری تاریخ شاہ آباد ضلع ہردوئی مصنفہ جناب مولوی مظفر حسین خاں
صاحب سلیمانی رئیس شاہ آباد کی مبسوط اور قابل قدر کتاب کو بالاستیعاب اور بغور

دیکھا ہے۔ میں جب ہی سے آپ کی خداداد قابلیت ہمہ دانی تحقیق و تدقیق کا دل و جان سے
معترف اور گرویدہ ہو گیا ہوں۔ اس کے بعد آپ کی کتاب **گنجینۂ سلیمانی** کے مطالعہ کرنے
کے بعد ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔ اب آپ کی ایک تازہ تصنیف موسومہ **چمنستان مظفر** میرے
سامنے ہے اس کو بھی میں نے الف سے ی تک پڑھا ہے اور اس کی نسبت بھی میری وہی
رائے ہے جو آپ کی دوسری تصانیف کے متعلق ہے۔ یہ کتاب آپ نے **پروفیسر سید
اولاد علی صاحب** کے حالات میں بطور **سوانح عمری** لکھی ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے
پہلے میں نے ان بزرگ کے حالات معلوم کرنا تو درکنار ان کے نام نامی سے بھی کان آشنا
نہ تھے الحمدللہ آپ نے بمصداق **اذکروا موتاکم بالخیر** مرحوم کو زندہ کر دیا
ہم نے اب جانا کہ سید صاحب واجد علی **شاہ اودھ** کے بھائی **صاحب عالم
مرزا محمد جواد علی بہادر جرنیل صاحب** کے نہ صرف مصاحب خاص اور مورد الطاف
شاہانہ و مراحم خسروانہ تھے بلکہ ان کے استاد بھی تھے۔ یہ سلطنت جب بمقتضائے لیل و نہار
صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تو بادشاہ کی والدۂ ماجدہ اور ولی عہد اور برادر موصوف جو اپنے
حقوق شاہی کے اثبات کے لئے انگلستان گئے تھے تو سید صاحب بوجہ تقرب بارگاہ
سلطانی اور قابلیت ذاتی کے اس سفر میں ہمرکاب تھے۔ افسوس ہے کہ یہ مشن بجائے کامیاب
واپس آنے کے بادشاہ کی والدہ ماجدہ اور بھائی یہ دونوں غالباً غم سے گھٹ گھٹ کے اسی سفر میں
ہی پیوند خاک ہو گئے اور جب یہ خانماں برباد قافلہ بچا کھچا ہندوستان کو واپس آیا اور سید صاحب
نے دیکھ لیا کہ ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اب وہاں بجز حرمان و یاس کے کیا خاک دھرا ہے تو وہ انگلستان ہی میں رہ پڑے
اور ڈبلن یونیورسٹی میں عربی اور السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ چونکہ سید صاحب بڑے
ذی علم اور صاحب فضل و کمال تھے ان کی بڑی قدر ہوئی ؎

قدرِ جوہر شہ بداند یا بداند جوہری

یہ ۳۰ سال تک بلا فصل مسلسل خدمت جلیلہ پروفیسری پر پر اجتے رہے۔ بلحاظ حالات موجودہ کے یہ کتنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ انگلستان کے متوطن ہو گئے اور وہیں ایک یورپین لیڈی سے شادی بھی کر لی جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جو آگے چل کر ڈاکٹر ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس قافلے کو ان کی مٹی ہندوستان سے انگلستان لوٹے گئی تھی کہ سید صاحب کا بھی ۱۸۹۰ء میں وہیں انتقال ہوا ؎

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ دوم خاکِ گور

اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے بڑی کوشش اور تلاش سے ان دلچسپ حالات کو فراہم کیا ہے جو بالکل پردۂ خفا میں تھے۔ یوں تو ساری تصنیفات آپ کی پڑھنے کے قابل ہیں لیکن یہ کتاب اک بے نظیر اور ایسا نادر مجموعہ ہے جس پر ہندوستانیوں کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے کہ ایک ہندی صرف اپنے تبحر علمی کی وجہ سے ہر ملک اور اجنبی لوگوں میں بھی کس طرح سے علمی دولت کی بدولت اعزاز و امتیاز حاصل کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ علم وہ لازوال دولت ہے کہ جس کی قدر ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ لوگ اس کتاب کو بشوق و ذوق پڑھیں گے اور دیکھیں گے کہ ہندوستان جنت نشان کی خاکِ پاک میں کیسی کیسی نادر الوجود قابلِ فخر اور قابلِ تقلید و تتبع ہستیاں گزری ہیں ؎

اے اہلِ گرتن سینہ بہاں تہ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

حررہ حقیر بشیر

دہلی ۱۲ نومبر ۱۹۲۵ء

تقریظ جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی

اُستاد شاہزادگانِ ملک اودھ حیدرآباد دکن رکن جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی

مصنّف کتب کثیرہ

میرے لائق عنایت فرما محمد مظفر حسین صاحب سلیمانی۔ ملک اودھ لکھنو کے امرا و علما و شعرا کے حالات کی زندہ تاریخ ہیں۔ آپ نے زحمت و تلاش سے بہت دلچسپ حالات بعض مشاہیر کے پیدا کئے ہیں جو قابل ستائش ہیں۔ چمنستانِ مظفر آپ کی تصنیف سنہ ۱۳۴۲ھ میں طبع ہوئی۔ دیکھنے کے قابل کتاب ہے۔ غرض کہ آپ کی کتاب ؎

چمنستاں بھی ہے گنجینہ بھی
حالِ اسلاف کا آئینہ بھی

سیّد علی حیدر
ناظر ادبی دارالترجمہ عثمانیہ۔ بازار نور خاں حیدرآباد دکن

۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

تقریظ جناب مولانا میرزا محمد ہادی صاحب لکھنوی رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامع عثمانیہ حیدرآباد دکن

چمنستانِ مظفر - اس کتاب میں منشی میر اولاد علی صاحب شاہ آبادی استاد و سکریٹری حضرت شاہزادہ سکندر حشمت میرزا محمد جواد علی بہادر برادر حقیقی شاہ اودھ کے حالات اور سوانح درج ہیں - اور ضمناً واقعات سلطنت بھی کہ جس میں انتزاع سلطنت اودھ اور اس کے متعلق جو اپیل انگلستان جاکر ملکہ وکٹوریہ قیصر ہندست کی گئی ہے نہایت شرح و بسط سے تحریر کئے گئے ہیں اور شاہی قافلہ پر جو واقعات افسوسناک گزرے ہیں وہ اس میں موجود ہیں - کتاب کی عبارت نہایت سلیس اردو زبان ہے - تاریخی و علمی مواد نہایت مستند و دلچسپ مہیا کیا گیا ہے - خود منشی اولاد علی جو سکریٹری قافلہ شاہی کے تھے اور ان کے پاس ذخیرہ شاہی کاغذات کا موجود تھا اور نیز مولوی مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہی اپنے ساتھ جو کاغذات لائے ان سے واقعات اخذ کئے گئے ہیں - اس کے ماورا منشی میر اولاد علی کی لیڈی جو قابل و تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور منشی صاحب موصوف کے فرزند میر ارشاد علی عرف مسٹر آرتھر جو نہایت ذہین اور ذی لیاقت شریف زادے تھے ان کی خط و کتابت سے بھی حالات کے لکھنے میں مدد ملی - یہ کتاب نہایت مفید اور قابل مطالعہ کے ہے اور اس کے مصنف محمد مظفر حسین صاحب صبا میرے ایک قدیمی قابل عنایت فرما ہیں اور ان کی حیات کا جزو اعظم تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں بسر ہوا ہے - ان کی سیر و سیاحت اور معلومات کے نمونے اس میں موجود ہیں - ہندوستان کے اکثر مشاہیر کا تذکرہ ہے - مجھے امید ہے کہ کتاب کے ملاحظہ سے لائق مصنف کی قدر کیجائیگی -

مرزا محمد ہادی لکھنوی سابق پروفیسر کالج لکھنو رکن جامع عثمانیہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء مقام حیدرآباد دکن

باغ مرلی دھر

تقریظ از جناب مولانا مولوی عبداللہ العمادی صاحب ناظر ادب دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

چمنستان مظفر

جناب منشی مظفر حسین صاحب، اُن بزرگ اہلِ قلم میں ہیں جن پر سخن طرازی و معنی پردازی کو ناز ہے۔ ان کے خامہ بدایع نگار سے متعدد کتابیں نکل چکی ہیں جنھیں بارگاہ ادب سے قبول عام کی تشریف مل چکی ہے۔ کتاب زیرِ نظر کو اگرچہ میں بخوبی مطالعہ نہ کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا پایہ بھی بہت بلند ہوگا ؎

سَمِعْتُ وَمَا رَأَیتُ وَلَوْ رَأَینَا

میں نے کتاب کی خبر تو سنی مگر دیکھی نہیں اور اگر دیکھنے کا اتفاق ہوتا

لَمَا ازْدَادَ العِیَانُ عَلَی السَّمَاعِ

تو بھی مشاہدے کو سماعت پر تفوق نہ ہو سکتا

۲۳ شعبان ۱۳۴۵ھ

عمادی

قطعہ تاریخ مصنفہ جناب جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل جانشین امیر مینائی اُستاد شہریار دکن

وہ مظفر حسین خاں نامی | صاحب علم و فضل و ماہر فن
جن سے رنگیں ہی نثر کا گلزار | جن سے تازہ ہے نظم کا گلشن
سرِ قرطاس ہی صبا رفتار | جن کے خامہ کا باد پا توسن
انھیں جادو رقم کی ہے تصنیف | یہ کتاب لطیف و مستحسن
صفحہ صفحہ ہے عارضِ خوباں | نقطہ نقطہ ستارۂ روشن
جتنے الفاظ ہیں وہ ہیں لاریب | گل و ریحان و یاسمین و سمن
جن کے حالات اس میں لکھے ہیں | وہ تھے فردِ جہاں شہیر زمن
اُن کا دم اُن کی ذات عالی تھی | مایۂ ناز و افتخار وطن
نام اولاد خوش نہاد علی | ہر تمثال زیر چرخ کہن
کارنامے ہیں ان کے قابل دید | جن کی توصیف میں زباں الکن
ان کے افکار گوہر شہوار | ان کے اشعار آبروئے سخن
الغرض یہ کتاب لاثانی | جانفزا دل ربا ضیا افگن
شکر ہی چھپ کے ہوگئی شائع | خوش ہوئے دوست جل گئے دشمن
اس گلستاں کا لطف نظارہ | دافع انتشار و رنج و محن
وہ کھلائے ہیں گل مصنف نے | جن کی بو سے ہی گرد مشک ختن
پھول کیا رنگ رنگ کے ہیں جلیل | لعل و گوہر کا جیسے ہو مخزن

مصرع سال سے ہے حقیقت حال

یہی دیکھا ہی بے نظیر چمن

۱۳ ھ ۴ ۵

فطرتِ اطفال

یعنی

فن تعلیم و تربیت کے متعلق انگریزی کی ایک مختصر لیکن نہایت مفید کارآمد اور دلچسپ کتاب کا ترجمہ۔ اساتذہ و والدین دونوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی۔ یہ رسالہ ۸۴ صفحہ کا ہی اور ابھی حال ہیں کانفرنس نے ترجمہ کرا کر عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہی۔

اولاد کی تعلیم کا معاملہ اس قدر اہم ہی کہ سب خاندانوں کی آیندہ ترقی اسی پر منحصر ہی اس لئے کسی شخص کو ایسے اہم مقصد پر چار آنے خرچ کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ جب آپ اس رسالہ کو غور سے پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ صرف چار آنے خرچ کر کے آپ نے کس قدر معلومات و تجربہ حاصل کیا خود بھی خریدیے اور صاحبِ اولاد احباب کو بھی خریداری کی ترغیب دیجیے۔

اطلاع:۔ مشاہیر مصنفین کی تالیفات کانفرنس بک ڈپو سے طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

وقارِ حیات

یعنی

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی حاجی محمد مشتاق حسین صاحب سابق ریونیو سکرٹری گورنمنٹ نظام و آنریری سکرٹری محمڈن کالج و بانی آل انڈیا مسلم لیگ

کی

نہایت مفصل، مکمل و دلچسپ و پُر از معلومات سوانح عمری جو ایجوکیشنل کانفرنس نے علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی

یہ سوانح عمری درحقیقت مسلمانوں کی گزشتہ پنجاہ سالہ زمانہ کی تعلیمی، سیاسی، اور قومی تاریخ اور عجیب و غریب واقعات کا مرقع ہے۔ حیدر آباد، علی گڑھ تحریک، اور اسلامی پالیٹکس کے متعلق بہت سے پُر اسرار و مخفی حالات اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں جو کسی دوسرے طریقہ سے معلوم نہ ہو سکتے

معہ مقدمہ

نوشتہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔ کاغذ سفید، تقطیع ۲۰/۲۶ ضخامت قریباً ۹۰۰ صفحہ معہ فوٹو نواب ص

قیمت پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ